راہِ خارزار
محی الدین نواب

اس کا نام زلیخا تھا۔ بنگالی زبان میں تلفظ کی ادائیگی مختلف ہو جاتی ہے۔ بعض افراد "ز" کو "ز" ہی کہتے ہیں اور "ج" بھی کہتے ہیں اور "خ" کو ہمیشہ "کھ" کہتے ہیں۔ اس لئے زلیخا کو جولیکھا پکارتے ہیں۔ زلیخا کے نام میں جتنا رومانس اور کشش ہے جولیکھا کہنے سے اس رومانس اور کشش کا اتنا ہی کباڑا ہو جاتا ہے۔

وہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر کے آئی تھی اس لئے بنگالی ہونے کے باوجود اپنا نام درست ادا کرتی تھی اور یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہاں کے لوگ اسے جولیکھا کہہ کر مخاطب کریں۔ اپنا نام بگڑنے سے انسلٹ محسوس ہوتی ہے مگر لوگ بھی مجبور ہوتے ہیں۔ اپنے علاقے کے مطابق بولتے ہیں جس طرح پنجاب میں اسکول کو سکول اور اسٹیشن کو سٹیشن کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ پنجابی نہیں انگریزی الفاظ ہیں ان کی ادائیگی علاقوں کی آب و ہوا کی طرح بدل جاتی ہے۔ بنگالی خدا نہیں کہتے کھدا میاں کہتے ہیں۔ وہاں کے مولوی اور علماء انہیں سمجھاتے ہیں کہ خدا میاں کہنے کی کیا ضرورت ہے' اللہ میاں یا اللہ تعالیٰ کہا کرو۔ اسی طرح زلیخا نے لندن سے واپس آکر اپنے نام کو نہایت مختصر کر لیا اور مخاطب کرنے والوں کہہ دیا کہ اسے جولیکھا نہیں' صرف جولی میڈم کہا کریں۔

(آدمی اپنی دنیا میں نام کے لئے جیتا ہے اور نام کے لئے مرتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ دنیا سے جانے کے بعد اس کا نام رہے لیکن دو طرح کے لوگوں کے نام قائم و دائم رہتے ہیں۔ ایک تو وہ جو زندگی میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتے ہیں اور وہ کارنامہ ان کے نام کے ساتھ تاقیامت بھلایا نہیں جا سکتا۔ دوسرے وہ جو اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے دیگر احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے جان کی بازی لگا دیتے ہیں اور شہید کہلاتے ہیں۔)

اسلام میں ملک و قوم کی خاطر یا دینی مقاصد کی خاطر جان دینے سے شہادت کا درجہ نصیب ہوتا ہے مگر وہاں ایک ایسا جوان بھی تھا جو اپنی زندگی میں شہید کہلاتا تھا۔ اس کا پورا نام شہید مرزا تھا۔ مرزا میں بھی "ز" آتی ہے۔ اس نے بڑی مشقوں کے بعد مرجا کے

بجائے مرزا کہنا سیکھ لیا تھا۔ عشق بہت کچھ سکھا دیتا ہے' اسے زلیخا سے عشق تھا۔ اس۔
درست تلفظ کے ساتھ زلیخا کہنا سیکھا تھا اور اپنے نام شہید مرزا کو بھی صحیح ادا کرنے لگا تھا۔
جو بنگالی کلام پاک کی تلاوت کرتے ہیں' وہی عربی زبان کے مطابق صحیح الفاظ ادا
کرتے ہیں۔ یہاں بات شہید مرزا کی ہے۔ اس نے زلیخا کے عشق میں صحیح تلفظ کے ساتھ
بولنا سیکھا تھا اور اس کے انتظار میں ہر جمعرات کی شام کو تیج گاؤں کے اس چوراہے پر کھڑا
رہتا تھا جہاں زلیخا کے باپ حبیب الرحمان کا شہید مینار بنایا گیا تھا۔ وہ ہر جمعرات کی شام کو
اپنی کار میں بیٹھ کر آتی تھی۔ باپ کے شہید مینار پر پھول چڑھاتی' فاتحہ پڑھتی اور چلی جاتی
تھی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ آتے جاتے وقت آس پاس نہ دیکھتی ہو۔ وہ ہمیشہ شہید
مرزا کو دیکھتی تھی۔ پہلے تو اس نے اسے نظر انداز کیا تھا۔ پھر اس کے متعلق سوچنے لگی
کیونکہ وہ اسے ایسے دیکھتا رہتا تھا جیسے دنیا میں اور کچھ دیکھتا نہ ہو اور صرف اسے دیکھ کر
بصارت حاصل کرتا ہو۔ ہفتے کے باقی چھ دن ساری دنیا کو دیکھنے سے انکار کرتا ہو۔

وہ شہید مینار سے اتنے فاصلے پر کھڑا رہتا تھا جہاں زلیخا کی کار آکر رکتی تھی۔ وہ کار
سے اترتے وقت اسے دیکھتی تھی۔ واپسی میں کار کے اندر بیٹھ کر بھی اس پر نظر پڑتی تھی
اور سوچتی تھی۔ "کوئی پرانے زمانے کا عاشق ہے۔ محبت نہیں' بھیک مانگنے کے انداز میں
کھڑا رہتا ہے۔ اسے شاید معلوم نہیں کہ میں لندن کے ماحول میں رہ کر آئی ہوں اور
بھیک مانگنے کا یہ انداز مجھے متاثر نہیں کر سکے گا۔"

وہ اچھی صورت کا صحت مند جوان تھا۔ کوئی بھی لڑکی اسے پسند کر سکتی تھی۔ شاید
وہ بھی کرتی تھی' کیونکہ یورپ اور امریکا میں بھی عشق کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہاں تو عشق بعد
میں ہوتا ہے پہلے تعلقات قائم ہوتے ہیں بلکہ بچے بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ بچے عشق کرنے
اور شادی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

شہید مرزا اونچے پورے قد کا جوان تھا۔ دیکھنے میں اتنا بھرپور تھا کہ زلیخا نے ایک بار
اسے خواب میں بھی دیکھا تھا۔ خواب بے مقصد بھی ہوتے ہیں لیکن شعور کے راستے سے
آئیں تو بامقصد ہو جاتے ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ وہ لندن کی اونچی سوسائٹی میں رہ کر آئی
تھی۔ ایسے میں دیسی مال کچھ پھیکا سا لگ رہا تھا۔ کہیں لاشعور میں کشمکش بھی تھی جس کا
شعوری طور پر علم نہیں تھا۔

عام طور پر' یا قدرتی طور سے لڑکیاں اپنے باپ کو زیادہ چاہتی ہیں۔ جوان ہو کر ایسا
آئیڈیل تلاش کرتی ہیں جو کسی حد تک ان کے باپ سے مماثلت رکھتا ہو۔ زلیخا عرف
جولی کے بابا حبیب الرحمان اسے سمجھاتے تھے۔ "بیٹی! تمہیں کوئی چیز پسند ہو اور اسے تم
کسی سے حاصل کرنا چاہو تو اس چیز سے بظاہر بے نیازی دکھاؤ۔ اگر وہ تمہیں دے تو اسے
ایسے لو' جیسے دینے والے کا دل رکھنے کے لئے قبول کر رہی ہو لیکن کبھی ایسا انداز اختیار
نہ کرو جیسے وہ چیز مانگنے والی ہو۔"

جولی نے بے شک ایک بار خواب میں دیکھا تھا۔ پھر وہ خیالوں میں بھی آنے لگا لیکن
سڑک کے کنارے اس کے کھڑے رہنے کا انداز بھیک مانگنے والوں جیسا تھا اور اس کے
باپ کے زریں اصولوں میں سے ایک اصول کے خلاف تھا۔ اس لئے وہ "اونہہ" کہہ کر
اسے خیالوں سے جھٹک دیتی تھی۔ پھر وہ جمعرات کا دن ہوتا تھا۔ جمعرات کو عام طور سے
خیرات دی جاتی ہے۔ "جمعرات بھری مراد" اور وہ بڑا ہی نامراد تھا۔

وہ بھی ایک جمعرات کا دن تھا۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی اپنے بابا کے شہید
مینار کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ وہ جوان حسب معمول اس جگہ ایسے
کھڑا ہوا تھا جیسے "کھڑے پیر" کی منت مانی ہو کہ جب تک منزل نہیں ملے گی وہ اسی طرح
کھڑا رہے گا۔ کوئی نادانی سی نادانی تھی' منزل چلتے رہنے والے کو ملتی ہے۔ ایک جگہ
کھڑے رہنے والے بوڑھے برگد بن جاتے ہیں۔

اس روز اس کے ہاتھ میں ایک سرخ گلاب تھا۔ اس روز اس نے اپنی جگہ سے
حرکت کی۔ جب وہ اپنی کار سے اتر کر جانا چاہتی تھی تب اس نے آگے بڑھ کر وہ گلاب
پیش کیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئی۔ یہ حرکت خلافِ توقع تھی۔ ایک جگہ جم کر کھڑا
رہنے والا بجلی کا کھمبا پھول نہیں دیتا' روشنی دیتا ہے۔ اور وہ ایسا کھمبا تھا جس کا بلب ٹوٹ
گیا تھا' بے نور تھا' بے اثر تھا اور بے مقصد کھڑا رہتا تھا۔

جولی نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ پھر ایک جھٹکے سے وہ پھول لے لیا۔ پھول محبت
اور خوشبو کی علامت ہے۔ اسے پیار سے قبول کرنا چاہئے لیکن اس نے قبول نہیں کیا تھا۔
چھین لیا تھا اور چھین کر اسے نیچے مٹی میں دے مارا تھا۔ پھول زلفوں پر سجتا ہے یا تربت پر
چڑھتا ہے لیکن مٹی میں نہیں ملایا جاتا۔ اس نے مٹی پر پھینک کر اس پر تھوک دیا۔
تھوک نشانے پر نہیں گیا۔ پھول کے قریب مٹی پر گرا۔ اس کے بابا نے سمجھایا تھا کہ لین

سادین میں محتاط رہا کرو۔ دیتے وقت تو مٹھی خالی ہوتی ہی ہے اس کے بدلے لیتے وقت مٹھی بھر بھر کے لیا کرو۔ اگر یوں نہ ملے تو سمجھ لو کہ دینے والا کمتر ہے یا عیار۔ ہے اور یہ تو کھلی عیاری تھی کہ وہ صرف ایک پھول دے کر پوری زلیخا مانگنے کی ابتدا کر رہا تھا۔

وہ تھوک کر پاؤں پٹختی ہوئی آگے بڑھی۔ پھر دو قدم چل کر رک گئی۔ اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ صرف دولت سے نہیں ہوتا کسی پر تھوک دینے سے بھی ہوتا ہے۔ اس نے سر گھما کر ایک شانِ بے نیازی سے دیکھا۔ مگر دیکھا تو پھر حیرانی سے دیدے پھیلا کر دیکھتی رہ گئی۔ وہ زمین پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس پھول کو اٹھا لیا تھا۔ پھر مٹی میں جہاں اس کا تھوک پڑا ہوا تھا وہ اسے دوسرے ہاتھ میں مٹی سمیت اٹھا رہا تھا۔ تھوک اور مٹی کی کھاد بنا کر گلاب کے ڈنٹھل سے لگا رہا تھا۔ محبت کے اس پھول کو زلیخا کے منہ سے نکلی ہوئی کھاد کے ساتھ اپنی ہتھیلی کے گلدان میں سجا رہا تھا۔

اب تو وہ دل میں کہہ سکتی تھی۔ "چھی چھی کیسی گندی حرکت ہے؟" لیکن ان لمحات میں اس نے ایسا نہیں سوچا۔ حالانکہ (انسان کو خود اپنے اندر کی گندگی ناگوار گزرتی ہے۔ اسی لئے تو وہ اپنے اندر کی چیز باہر پھینک دیتا ہے لیکن پھینکی ہوئی چیز کو کوئی پیار سے اٹھالے تو اس چیز کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ جتنی انسانی غلاظتیں ہوتی ہیں وہ کھیتوں میں اور باغوں میں پہنچتی ہیں۔ فصل اگاتی ہیں یا پھول کھلاتی ہیں اس لئے ناگوار چیز کی نوعیت کبھی بدل بھی جاتی ہے ہم لقمہ چباتے وقت اور خوشبو سونگھتے وقت یاد نہیں رہتا کہ یہ نعمتیں کہاں سے گزر کر آئی ہیں۔ ایسے ہی کچھ باتیں کہنے اور سننے میں اچھی نہیں لگتیں لیکن اچھی نہ لگنے کے باوجود حیاتِ انسانی میں گردش کرتی رہتی ہیں)

ایک کو خوشبو مل رہی تھی اس نے اسے ٹھکرا دیا۔ دوسرے کو بدبو ملی' وہ اس بُو کا خوشبو سے رشتہ جوڑنے لگا۔ وہ پلٹ کر اپنے مرحوم بابا کی یادگار کی سمت جانے لگی۔ اس کی رفتار سست ہو گئی تھی (عورت کے پاؤں پکڑنا مرد کی شان کے خلاف ہے اور ایک ناپسندیدہ عمل ہے مگر کوئی کانٹا نکالنے کے لیے عورت کے پاؤں پکڑے تو پھر عورت کے سر میں سماجاتا ہے۔ یہ عمل کی خوبی ہوتی ہے جو ناگواری کو گوارا بنا دیتی ہے۔)

وہ شہید مینار کے پاس آکر رک گئی۔ اس نے سر پر آنچل رکھ کر ڈرائیو کے ہاتھوں سے پھولوں کی مالا لی۔ وہاں اس کے بابا حبیب الرحمان کا نام کندہ کیا گیا تھا۔ اس نے جھک کر نام کے چاروں طرف پھولوں کی مالا سجا دی۔ پھر سیدھی ہو کر دونوں ہاتھ اٹھا کر دُ

پڑھنے لگی۔

اتنے دنوں میں وہ جوان پہلی بار دعا کے دوران آ آ کر اٹکنے لگا۔ ویسے دعا پڑھنے میں غلطی نہیں ہو رہی تھی۔ عربی زبان کی دعائیں ایسے ذہین نشین ہوتی ہیں کہ غریب آٹے دال کے بھاؤ میں الجھتا رہتا ہے' امیر نوٹ گنتا رہتا ہے اور دعائیں پڑھتا جاتا ہے۔ اس کے باوجود دعاؤں کا ایک ایک حرف درست ہوتا ہے۔ زلیخا بھی لاشعوری طور پر دعائیہ کلمات ادا کر رہی تھی اور شعوری طور پر اس جوان کے متعلق سوچ رہی تھی۔

جب اس نے دعا پوری کر کے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا تب خیال آیا کہ وہ ابھی کہاں ہے؟ اور ابھی وہ پڑھ رہی تھی یا اسے سوچ رہی تھی۔ دو کام بیک وقت نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے ہیں تو ایک کام دوسرے پر حاوی ہوتا ہے اور وہ حاوی ہو گیا تھا اور دعا رسمی ہو گئی تھی۔

وہ پلٹ کر کار کی طرف آئی تو وہ نہیں تھا۔ وہ ایسی ضدی اور خود سر تھی کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ جو ہم رتبہ نہ ہو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی تھی۔ اس بار تجسس پیدا ہوا کہ کمبا اپنی جگہ سے کہاں چلا گیا۔ وہ متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس کی خودسری نے منع کیا۔ وہ کہیں دیکھے بغیر کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔

فرنگیوں کے دور میں جب ریل گاڑی کی ابتدا ہوئی تو اس وقت ڈھاکا کے ریلوے اسٹیشن کا نام پھول باڑی تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی یہ نام ختم ہو چکا تھا۔ اب تاریخ کی کتابوں میں یا بوڑھوں کی زبان پر وہ نام رہ گیا تھا۔ حبیب الرحمان کو یہ نام بہت پسند تھا۔ وہ دریا کے کنارے پہلے ایک میل تک پھیلی ہوئی زمینوں کا مالک تھا۔ اس نے اپنے علاقے کا نام پھول باڑی رکھ لیا۔ محمد پور اور میرپور کے درمیان سے جو راستہ گزرتا ہوا اندرون ملک گیا ہے' اسی راستے پر جو پہلا دریا آتا ہے اس دریا کے ساحلی علاقوں کا مالک حبیب الرحمان تھا۔ اس نے انگریز سرکار کی اجازت سے ایک فیری سسٹم قائم کیا تھا جو کاریں' ٹرک وغیرہ اس راستے سے گزر کر میمن سنگھ اور رنگ پور وغیرہ کی طرف جاتے تھے انہیں حبیب الرحمان کا بڑا فیری پلیٹ فارم دریا پار کراتا تھا۔ یوں کھیتی باڑی کے علاوہ فیری سسٹم نے بھی حبیب الرحمان کی آمدنی میں بڑا اضافہ کیا تھا۔

ساحلی حصوں میں ماہی گیر آباد تھے اور روزانہ کئی من مچھلیاں پکڑ کر شہری مہاجنوں کو دیتے تھے اور وہ سب حبیب الرحمان کے چاکر تھے۔ اس حساب سے وہ اتنا دولت مند

تھا کہ اس نے اپنی لاڈلی بیٹی زلیخا کو پڑھنے کے لیے لندن بھیجا تھا۔ وہ چودہ برس کی عمر میں گئی تھی اور چوبیس برس کی عمر میں واپس آئی تھی۔ ان دس یا ساڑھے دس برسوں میں چھ یا سات بار بنگال آئی گئی۔ اس دوران ماں کا انتقال ہو گیا۔ انگریز چلے گئے۔ ہندوستان تقسیم ہو گیا' بنگال کے بھی دو حصے ہو گئے۔ ان میں سے ایک مشرقی پاکستان بن گیا۔

اس دوران وہ اپنی بیٹی کو بتاتا رہا کہ وہ کس طرح سیاسی معاملات سے کنارہ کشی کرتا رہتا ہے۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے بیٹی کو سمجھاتا تھا کہ ان کے پاس زمینیں ہیں۔ مچھلیوں کا کاروبار اور فیری سسٹم سے کافی آمدنی ہوتی ہے۔ اس لئے سیاست میں آ کر ایک پارٹی کے ہو کر دوسری پارٹی کو دشمن نہیں بنانا چاہئے۔

جب پاکستان کے قیام کے لئے جدوجہد ہو رہی تھی تو کانگریس والے بھی آتے تھے۔ وہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کمزور تھی لیکن اس کی پشت پر انگریز تھے۔ ادھر کے صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر نے اسے مشورہ دیا "مسٹر رحمان! کانگریس کا ساتھ دو۔ مسلم لیگ کا جھنڈا اتار دو۔ ہم تمہیں اور زمینیں دیں گے۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں سیاست نہیں جانتا۔ کچھ لوگ آتے ہیں مسلم لیگ کا پرچم لہرا کر چلے جاتے ہیں۔ کانگریس والے بھی آ کر ترنگا لہرائیں گے تو میں منع نہیں کروں گا۔ اپنی چھت پر تو ابھی تک یونین جیک "برطانوی پرچم" لہراتا ہوں۔ میں تو آپ کا تابعدار ہوں' آپ میرے علاقے میں سیاسی فسادات نہ ہونے دیں۔ بڑی مہربانی ہو گی۔"

زلیخا نے پوچھا تھا۔ "بابا! پھر آپ نے کیا کیا؟ یہ تو ایک کو خوش کرنے اور دوسرے کو دشمن بنانے والی بات ہے۔"

"بیٹی! یاد رکھو کبھی سیاست میں نہ جانا۔ ہمیں ہماری فصل' ہماری مچھلیاں اور فیری سسٹم زندہ رکھتے ہیں۔ سیاست مارتی ہے۔ اس لئے میں دونوں طرف کی پارٹیوں کو اور صاحب بہادر کو بھی خوش رکھتا رہا۔ اب تو پاکستان بن گیا ہے' تم تعلیم سے فارغ ہو کر آؤ تو سیاست میں سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ مسلم لیگ کو جیتنا ہی جیتنا ہے۔ اس لئے میں نے اپنے کسانوں اور مچھیروں کے کانوں میں "یہ بات" پھونک دی تھی کہ وہ مسلم لیگ کا ہی ساتھ دیں۔ تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ آج ہماری زمینیں دو میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔"

باپ نے چند زرّیں اصول بنا رکھے تھے۔ بیٹی انہی اصولوں پر عمل کیا کرتی تھی۔

حبیب الرحمان پاکستان بنتے ہی بیٹی سے ملنے آیا تھا۔ جب واپس گیا تو زلیخا کو باپ کا ایک خط ملا۔ اس میں لکھا تھا۔ "یہاں کے حالات اچانک بگڑ رہے ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر کے دوران فیصلہ کن انداز میں کہا ہے کہ پاکستان کی زبان اردو اور صرف اردو ہو گی۔ یہ سن کر بنگالیوں کی اکثریت مشتعل ہو گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم بنگالیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ لہٰذا پاکستان میں اکثریت کے حساب سے قومی زبان بنگالی ہو گی۔ یہاں مخالفت میں نعرے لگائے جا رہے ہیں "اردو بھاشا چول بے نا۔ راشٹریہ بھاشا بانگلا ہوبے۔ بانگلا ہوبے............"

یہاں جلوس بھی نکالے جا رہے ہیں۔ تم تو جانتی ہو۔ میں سیاست سے دور رہتا ہوں مگر ہمارے علاقے میں بھی لوگ اپنی بنگالی بھاشا کی حمایت میں بول رہے ہیں۔ میں تو چپ چاپ تماشا دیکھتا ہوں۔ کبھی کبھی جذباتی جوانوں کے درمیان پھنس جاتا ہوں تو اس علاقے کا بڑا ہونے کی حیثیت سے لیڈروں کے انداز سے اردو کے خلاف اور بنگلہ بھاشا کی حمایت میں نعرے لگاتا ہوں۔ میرے علاقے کے تمام لوگ مجھ سے بہت خوش ہیں اور میری تعریفیں کرتے ہیں۔ بڑی مشکل ہے۔ میں لیڈر بننا نہیں چاہتا مگر لوگوں نے بنا دیا ہے۔ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ میں کچھ عرصے کے لئے تمہارے پاس لندن آ کر رہوں۔ یہاں معاملہ ٹھنڈا ہو گا تو واپس آ جاؤں گا۔"

خط میں اور بہت کچھ لکھا تھا۔ وہ خوش ہو گئی کہ چلو بابا آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ اچھے دن گزریں گے اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ سیاست میں دوغلے پن سے باز رہیں گے' نہ بنگلہ بھاشا کی حمایت میں بولیں گے اور نہ ہی اردو زبان کی حمایت میں کوئی بیان دیں گے۔

وہ اپنے بابا کا انتظار کرنے لگی۔ وہ ایک ہفتے کے اندر آنے والا تھا مگر نہیں آیا۔ دوسرے ہفتے اطلاع ملی کہ پلٹن میدان میں بہت بڑا جلسہ ہو رہا تھا۔ اس جلسے میں بڑے ہنگامے ہوئے تھے۔ حبیب الرحمان بنگلہ زبان کو قومی بنانے کے حق میں لڑتے لڑتے شہید ہو گیا ہے۔

یہ اطلاع پا کر زلیخا حیران رہ گئی۔ تھوڑی دیر تک باپ کی موت پر آنسو بہانا بھول گئی۔ اس کے دماغ پر یہ سوالیہ آندھی چلی رہی تھی کہ بابا شہید ہو کیسے ہو گئے؟ وہ تو نہ

ادھر تھے‘ نہ اُدھر تھے۔ کیا گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پس گئے تھے؟

تب اسے رونا آیا۔ وہ باپ سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ شہید ہوئے تھے یا نہیں یہ بعد میں سمجھنے کی بات تھی۔ مگر یہ سچ تھا کہ وہ مرگئے تھے اور اب کبھی بیٹی سے ملنے کے لئے نہیں آنے والے تھے۔ اس نے رو رو کر فیصلہ کیا جس فلائٹ میں سیٹ ملے گی‘ اس میں جا کر باپ کا آخری دیدار کرے گی لیکن فون پر اسے منع کیا گیا کہ وہ نہ آئے۔ وہاں احتجاج کرنے والوں اور شہید ہونے والوں کو باغی کہا جا رہا ہے۔ ان کے رشتے داروں کو گرفتار کیا جا رہا ہے لہٰذا اسے ابھی لندن میں رہنا چاہئے۔

اب وہ لندن میں کیا‘ دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ تنہائی کا صدمہ محض باپ کی موت سے تھا ورنہ اور کوئی صدمہ تھا نہ فکر۔ اپنے ملک میں کافی دولت تھی‘ آمدنی کے کئی ذرائع تھے۔ پھر زندگی کو اپنے انداز میں گزارنے والی ذہانت یا چالاکی تھی۔ وہ اپنے بابا کے زرّیں اصولوں پر عمل کر کے ایک اچھی اور کامیاب زندگی گزار سکتی تھی۔

رفتہ رفتہ زبان کا مسئلہ کسی حد تک سرد پڑ گیا۔ زلیخا ایک دن خاموشی سے چلی آئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دوسروں کو اس کے آنے کی اطلاع ملے اور ایک شہید کی بیٹی کو ائرپورٹ سے لانے کے لئے جلوس نکالے جائیں اور نعرے لگائیں جائیں۔ باپ نے اپنی زندگی میں اسے سمجھا دیا تھا کہ ہمیشہ سیاست میں دور رہنا چاہئے۔

وہ ائرپورٹ سے ٹیکسی میں بیٹھ کر پھول باڑی کی حویلی میں آئی تو پورے علاقے میں چرچا ہو گیا کہ مالکن آگئی ہیں۔ کسانوں‘ ماہی گیروں اور دوسرے لوگوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ وہ سب لوگ اس کے بابا کی حمایت میں نعرے لگا رہے تھے کہ شہید حبیب الرحمان کا خون رنگ لائے گا۔ وہ حویلی کی بالکونی میں کھڑی جدھر دیکھ رہی تھی لوگ اس کے بابا کو شہید کہہ رہے تھے۔ اس نے دو چار بزرگوں اور جوانوں کو بلا کر پوچھا۔ ”میرے بابا کیسے شہید ہوئے تھے؟“

ایک بزرگ نے کہا۔ ”پولیس نے جلوس پر لاٹھی چارج کیا تھا۔ باغیانہ انداز تقریر کرنے سے منع کیا تھا۔ پھر فائرنگ بھی ہوئی۔ بھگدڑ شروع ہو گئی۔ کچھ بھاگنے لگے‘ کچھ مقابلہ کرنے لگے۔ کتنے ہی شہید ہوئے اور کچھ گرفتار بھی ہوئے اسی ہنگامے میں ہمارے مالک نے پوری قوم کے حق میں آواز بلند کرتے ہوئے اپنی جان دے دی۔“

وہ بولی۔ ”تم لوگ ہماری زمینوں پر رہتے ہو۔ ہمارے ساحلوں سے مچھلیاں پکڑتے

ہو۔ ہمارے کھیتوں کا اناج کھاتے ہو۔ کیا تم ہزاروں میں سے کوئی بھی نمک حلال نہیں تھا جو بابا کو وہاں سے بچا کر لے آتا؟“

”مالکن! وہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی کہ کون کہاں ہے؟ ہاں ایک جوان تھا۔ اس نے شاید انہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔ خود بھی زخمی ہوا تھا مگر بیچارہ انہیں بچا نہ سکا۔ وہی ان کی لاش اٹھا کر لایا تھا۔“

وہ لاش اٹھا کر لایا تھا۔ اس نے کوئی کمال نہیں کیا تھا۔ اگر اس کے بابا کو زندہ سلامت لے آتا تو وہ اسے منہ مانگا انعام دیتی۔

اس نے کہا۔ ”مجھے بابا کی قبر پر لے چلو۔ میں وہاں ایک شہید مینار تعمیر کروں گی۔“

”ان کی قبر تو یہاں کے قبرستان میں ہے لیکن بنگلہ بھاشا کے لئے جہاد کرنے والے جوان حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ شہیدوں نے جس جگہ جان دی ہے وہیں ان کی یادگار بنانے کی اجازت دی جائے لیکن پلٹن میدان میں کسی کو قبر یا کسی طرح کی یادگار بنانے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے۔“

زلیخا نے کہا۔ ”وہ ڈھاکا میں شہید ہوئے اور ان کی قبر ڈھاکا سے پچاس میل دور بنائی گئی ہے اور پھر یادگار تعمیر کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ یہ تو ظلم ہے۔“

”جی ہاں۔ اس ظلم کے باوجود جان کی بازیاں لگانے والے جوان ڈھاکا‘ تیج گاؤں اور کرمی ٹولہ میں کہیں نہ کہیں ان کی یادگار قائم رکھنے کے لئے سنگِ بنیاد رکھ رہے ہیں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”سنا ہے جو نوجوان آپ کے بابا کی لاش اٹھا کر لایا تھا اس نے تیج گاؤں کے ایک چوراہے پر آپ کے بابا کا نام لکھا ہے اور یادگار کے طور پر وہاں چند پتھروں کا ڈھیر لگایا ہے۔“

”وہ میرے بابا سے اتنی عقیدت رکھتا ہے کہ اس نے تیج گاؤں کے چوراہے پر ان کا نام لکھا ہے۔ وہاں ان کی یادگار قائم کی ہے۔ وہ دنیا کو بتا رہا ہے کہ میرے بابا شہید ہوئے ہیں۔ اس جوان میں ایسا جذبہ نہ ہوتا تو وہ یہاں قبرستان میں گمنام رہتے۔ میں اس سے ضرور ملاقات کروں گی۔ اس کا نام کیا ہے؟“

ایک نے بتایا کہ اس کا نام شہید مرزا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جو ہر جمعرات کی شام کو اس کے انتظار میں کھڑا رہتا ہے اس کا نام شہید مرزا ہے۔ اس علاقے کے لوگ اس کا پتا ٹھکانا نہیں جانتے تھے۔ جو ڈرائیور اسے کار میں لے جایا کرتا تھا‘ وہ نیا تھا‘ کسی کو

نہیں جانتا تھا۔ زلیخا نے پہلی بار اس چوراہے پر جا کر دیکھا۔ اب وہاں یادگار کے طور پر محض پتھر نہیں رکھے ہوئے تھے بلکہ خوب صورت سے ڈیزائن کا ایک پختہ مینار بنا ہوا تھا‘ جو تقریباً دس فٹ اونچا تھا اور وہاں جلی حروف میں اس کے بابا حبیب الرحمان کا نام کندہ کرایا گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے شہید مینار کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ اس انجانے اجنبی جوان سے بھی متاثر ہوئی۔ اس جوان نے حکومت کی سختیوں کے باوجود وہ مینار تعمیر کرا کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس کے بابا شہید ہیں اور شہیدوں کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ کبھی نہیں مرتے اور یہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ جو شہید ہوتے ہیں وہ دوسرے مسلمانوں میں حوصلے اور جاں نثاری کا جذبہ قیامت تک پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ان کی شہادت اسی لئے زندہ اور تابندہ رہتی ہے۔

زلیخا نے اپنے علاقے کے کسانوں‘ مچھیروں اور دیگر رعایا کو حکم دیا کہ اس نوجوان کو تلاش کر کے اس سے ملاقات کرائیں۔ اس نے خود ڈھاکا ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے ایک افسر سے معلوم کیا کہ اس کے بابا حبیب الرحمان کا وہ شہید مینار کس نے تعمیر کرایا ہے؟ اس سلسلے کی فائل دیکھ کر بتایا گیا کہ تیج گاؤں چوک کے قریب جو زمین ہے اس کا مالک شہید مرزا ہے۔ چونکہ وہ زمین کا مالک ہے اس لئے اسے وہ مینار تعمیر کرنے سے روکا نہیں گیا ہے۔

وہ اس کا پتا نوٹ کر کے وہاں گئی تو اس کی کوٹھی میں تالا لگا ہوا تھا۔ چوکیدار نے بتایا کہ صاحب کسی کاروباری سلسلے میں مغربی پاکستان گئے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں کب واپس آئیں گے۔

وہ مایوس ہو کر واپس آ گئی۔ وہ ایسے کارنامے کرنے والا اور پھر تلاش کے باوجود نہ ملنے والا اس کے حواس پر چھا رہا تھا۔ پھر وہ اسے کیوں نہ چاہتی‘ جو اس کے بابا کو اتنی عقیدت سے چاہتا تھا۔ ایسے وقت وہ اپنے بابا کے اس زریں اصول کو بھی بھول گئی کہ تمہیں کوئی چیز پسند ہو اور اسے تم کسی سے حاصل کرنا چاہو تو اس چیز سے بظاہر بے نیازی دکھاؤ۔ اگر وہ تمہیں دے تو اسے ایسے لو جیسے دینے والے کا دل رکھنے کے لئے قبول کر رہی ہو۔

باپ کا یہ اصول بڑا پہلودار تھا۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ کسی کی جستجو دیوانہ وار نہ کرو ورنہ وہ حواس پر چھا جائے گا۔ کسی چیز کو‘ کسی شخص کو اپنی ضرورت سے ذرا سا گھٹا

دیا کرو کیونکہ انسانی زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ بے لگام ہوتی ہے‘ وہ ضرورت ہے۔

وہ اپنے علاقے سے آمدنی کے ذرائع بڑھانے اور اس پسماندہ علاقے کو ایک ذرا ماڈرن بنانے کے لئے وہاں کے چند ماہرین سے پروگرام طے کر کے آئی تھی۔ وہاں کے ساحلی علاقے میں جو ماہی گیر آباد تھے‘ وہ برسوں بلکہ صدیوں پرانے طریقوں سے مچھلیاں پکڑتے تھے۔ صبح کی اذان سے پہلے ہی شہر کے مہاجن آ کر اپنی طے شدہ قیمتوں پر مچھلیاں اور جھینگے لے جاتے تھے۔ زلیخا کے باپ دادا مجبور ہو کر ان مچھیروں سے کہتے تھے کہ مہاجنوں کی طے شدہ قیمتوں پر دینا ہی ہو گا ورنہ مچھلیاں شام کے بعد سڑنے گلنے لگیں گی۔ انہیں زیادہ سے زیادہ نمک لگا کر کچھ عرصے تک کھانے کے قابل بنایا جاتا تھا لیکن ان میں اور تازہ مچھلیوں کی لذت میں اور ان کی ڈیمانڈ اور سیل میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس لئے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مہاجن خوب سمجھتے تھے کہ مچھلیاں شام تک مچھیرے نہیں رکھیں گے۔ مجبور ہو کر مہاجنوں کو ضرور دیں گے اس لئے اس علاقے کے مالکوں اور مچھیروں کو کم اور مہاجنوں کو زیادہ منافع حاصل ہوتا تھا۔

اس کے بابا حبیب الرحمان نے اپنی زندگی میں ایک برف کی فیکٹری قائم کی تھی تاکہ بچی ہوئی مچھلیوں اور جھینگوں کو مزید ایک دو دن محفوظ رکھا جائے۔ اس کا محض اتنا فائدہ ہوا کہ باقی رہ جانے والا مال اونے پونے فروخت ہو کر منافع کچھ زیادہ دینے لگا لیکن اس دوران علاقے میں بجلی برائے نام تھی۔ اس لئے برف فیکٹری ہفتے میں دو چار دن بند رہا کرتی تھی۔

چند جاپانی ماہرین نے وہاں معائنہ کرنے کے بعد زلیخا سے کہا۔ ”یہاں کے دریا میں کیکڑے زیادہ ہیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ بیرونی ممالک میں کیکڑوں کی ڈیمانڈ کتنی زیادہ ہے۔ اگر انہیں پکڑنے‘ فریز کرنے اور ان کا گوشت الگ اور سوپ الگ پیک کرنے کے جدید آلات منگوائے جائیں اور اس سلسلے میں یہاں کے لوگوں کو کام کرنے کی باقاعدہ تربیت دی جائے تو آپ کو جو بے انتہا منافع حاصل ہو گا اس کا اندازہ آپ تو کیا ہم بھی نہیں کر سکتے۔“

ان دنوں وہ مچھلیوں‘ جھینگوں اور کیکڑوں کے کاروبار کے معاملات میں مصروف رہا کرتی تھی اور ہر جمعرات کی شام شہید مرزا کو اپنے بابا کے شہید مینار کے قریب اپنے انتظار میں دیکھا کرتی تھی۔ کاروبار کے ذریعے لاکھوں کروڑوں ٹاکا (روپے) کمانے کی دُھن

میں اس کا انتظار کرنے والا عاشق سڑک کے کنارے بھیک مانگنے والا دکھائی دیتا تھا۔ جب تک وہاں جاپانی ماہرین رہے، وہ شہید مرزا کی کوٹھی کی طرف دوبارہ نہ جا سکی۔ ویسے کوٹھی کے چوکیدار کے پاس پیغام چھوڑ دیا تھا کہ جب بھی شہید مرزا صاحب تشریف لائیں ان سے ایک شہید کی بیٹی کی التجا پیش کی جائے کہ وہ آکر ضرور اس سے ملاقات کرلیں۔

وہ لاکھوں کروڑوں کا منافع دینے والے کاروبار اور ایک شاندار کوٹھی میں رہنے والے شہید مرزا کو اہمیت دے رہی تھی۔ اس لئے سڑک چھاپ عاشق کو لفٹ نہیں دے رہی تھی اور جب اس نے گلاب کا پھول پیش کر کے لفٹ حاصل کرنا چاہی تو وہ تھوک کر اسے نظرانداز کر گئی تھی۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ اسے تھوک کر چاٹنا بھی ہو گا۔

وہ بھی تماشا کر رہا تھا۔ خود کو دکھا بھی رہا تھا اور چھپا بھی رہا تھا۔ اسی شہر میں تھا اور اپنی کوٹھی میں بھی رہتا تھا۔ چونکہ تنہا تھا اس لئے کوٹھی ویران سی لگتی تھی۔ ایک چوکیدار کے سوا کوئی ملازم بھی نہیں رکھا تھا۔ وہی چوکیدار کوٹھی کو اندر سے صاف ستھرا رکھتا تھا۔ اس نے اپنے صاحب کے حکم کے مطابق زلیخا سے کہہ دیا تھا کہ وہ موجود نہیں ہیں کاروبار کے سلسلے میں مغربی پاکستان گئے ہیں اور پتا نہیں کب ان کی واپسی ہو گی۔

جب جاپانی ماہرین اسے معقول مشورے دے کر واپس چلے گئے تو وہ پھر شہید مرزا کی کوٹھی میں آئی۔ چوکیدار نے کہا۔ "صاحب کا فون آیا تھا۔ میں نے آپ کا پیغام دیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے، ڈھاکا واپس آنے میں دیر ہو سکتی ہے۔ آپ ان سے فون پر گفتگو کرنا چاہیں تو کسی بھی جمعرات کو شام چار بجے کوٹھی میں آجائیں وہ اُدھر سے کال کریں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "میں تو ہر جمعرات کو ڈھاکا تیج گاؤں آتی ہوں۔ اگلی جمعرات کو ضرور آؤں گی۔"

وہ بھی جمعرات کا مغرب کا وقت تھا جب چوکیدار سے آئندہ جمعرات کو آنے کی بات کر رہی تھی۔ چار بج چکے تھے ورنہ اسی دن فون پر شہید مرزا سے باتیں ہو جاتیں۔ وہ واپس پھول باڑی جانے لگی۔ اس کوٹھی سے پھول باڑی جانے کے لئے اسی چوک سے گزرنا ہوتا تھا جہاں اس کے بابا کا شہید مینار تھا۔ اس مینار کے قریب ہی وہ جگہ بھی تھی جہاں اس نے گلاب کے پھول کو مٹی میں پھینکا تھا اور تھوک دیا تھا۔

تھوکنے کے بعد شاید اسے اپنی اوقات معلوم ہوئی ہو گی۔ اسی لئے وہ چلا گیا تھا۔

زلیخا نے وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا، جہاں وہ اس کے انتظار میں کھڑا رہتا تھا، وہاں وہ تو نہیں تھا لیکن وہ گلاب کا پھول تھا۔ زمین پر گرا ہوا نہیں تھا، اس پھول کے ڈنٹھل کا آخری سرا گیلی مٹی میں ایسے گڑا ہوا تھا جیسے اس دیوانے نے تھوک اور مٹی کی کھاد بنا کر وہاں گلاب کا پودا لگایا ہو۔ وہ ٹھکرایا ہوا گلاب اپنے ڈنٹھل کے اوپری سرے پر مسکرا رہا تھا اور ہوا کی زد میں لرز رہا تھا۔ ہوا کی زد میں دیئے کی لو بھی لرزتی ہے مگر بجھتی نہیں ہے وہ لرزتا ہوا گلاب بھی نہیں گر سکتا تھا اسی طرح کھڑا رہ سکتا تھا۔ بس اتنا ہے کہ ہوا سے لڑنے کا حوصلہ سلامت رہنا چاہئے۔

ڈھاکہ مسجدوں کا شہر کہلاتا ہے۔ وہاں بے شمار مسجدیں ہیں اور صرف مسجدیں ہی نہیں نمازی بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ بنگالی پکے مسلمان ہوتے ہیں اور دینِ اسلام کے احکامات پر سختی سے عمل کرتے ہیں لیکن پھول باڑی میں کوئی پختہ مسجد نہیں تھی۔ دو میل کے علاقے میں چار مسجدیں بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئی تھیں۔ ٹین کی چھتیں تھیں۔ زلیخا کے باپ دادا نے کچھ رقم لگا کر فرش کو پختہ بنا دیا تھا۔ وہ اس علاقے کے مالک تھے۔ انہوں نے دین کے نام پر اپنی دولت میں سے تھوڑی سے سیمنٹ بجری خرید کر ثواب کما لیا تھا۔

وہاں تقریباً پانچ ہزار مسلمان تھے۔ وہ علاقے کے ایک مالک کے بعد دوسرے مالک سے عرض کرتے تھے کہ پھول باڑی میں ایک بڑی سی پختہ جامع مسجد تعمیر کی جائے۔ ہر آنے والا مالک انہیں سمجھاتا تھا۔ ذرا صبر کرو چندہ جمع کرتے رہو۔ ہم ایک دن شاندار مسجد تعمیر کریں گے۔

اسی روز زلیخا حویلی میں آئی تو پھول باڑی کے چند مولوی حضرات اس سے ملاقات کے لئے آئے۔ وہ انہیں بے زاری سے دیکھ کر بولی۔ "یورپ میں کسی سے ملاقات کرنے سے پہلے وقت مقرر کیا جاتا ہے۔ وہاں اپائنٹ منٹ کے بغیر ملاقات نہیں ہوتی۔ آپ جیسے پڑھے لکھے مولویوں کو اتنی سمجھ ہونی چاہئے۔ خیر جب آ ہی گئے ہیں تو فرمائیں کیا پرابلم ہے؟"

ایک مولوی صاحب نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ آپ کو اور زیادہ علم اور دولت سے مالا مال کرے۔ ہم مسجد کے سلسلے میں عرض کرنے آئے ہیں۔ یہاں تو سال بھر کسی نہ کسی وقت بارش ہوتی ہی رہتی ہے۔ ٹین کی چھتیں ٹپکتی رہتی ہیں۔ ایسا نماز کے دوران اکثر ہوتا

ہے۔ ہم نے آپ بزرگوں سے بھی درخواست کی تھی۔ اگر ایک بڑی سی پختہ چھت والی مسجد بن جائے تو............"

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "تو کیا ہو گا؟ نماز پڑھنے کا ثواب تو اتنا ہی ملے گا' جتنا ابھی ملتا ہے۔ آپ حضرات دیکھ رہے ہیں کہ یہاں جاپانی ماہرین آئے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ سروے کرنے کے بعد کہا ہے کہ مچھلیوں کے کاروبار میں منافع کئی گنا بڑھ جائے گا۔ یہ پھول باڑی ایک شہر جیسا ہو جائے گا۔ یہاں ہائی اسکول' اسپتال اور روزگار کے ذرائع ہوں گے۔ یہاں کے گھروں میں فاقے نہیں ہوں گے۔ آپ کی عورتوں اور بچوں کو صحت' تعلیم اور بہت ہی خوش حال زندگی ملے گی۔ نماز تو درختوں کے نیچے بھی پڑھی جا سکتی ہے مگر آپ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ درختوں کے نیچے زندگی نہیں گزار سکتے۔ میں لندن سے آتے ہی آپ لوگوں کی بھلائی کے لئے اتنا بڑا پروجیکٹ شروع کر رہی ہوں جس میں لاکھوں بلکہ کروڑوں ٹاکا خرچ ہوں گے۔ کیا آپ میری پریشانیوں اور مشکلوں کو سمجھتے ہیں کہ اتنے بڑے پروجیکٹ کے لئے حکومت کے ترقیاتی فنڈ سے رقم حاصل کرنے کے لئے کیسے کیسے ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے اور دن رات کتنی بھاگ دوڑ کرنی ہو گی۔ اتنی جان لڑانے کے بعد فائدہ مجھے نہیں پوری پھول باڑی کی آبادی کو ہو گا۔ آپ لوگ کنوئیں کے مینڈک نہ بنیں۔ چھوٹے دماغ سے چھوٹی باتیں صرف اپنی ذات کے لئے نہ سوچیں۔ پورے پھول باڑی کے محنت کشوں' ان کی عورتوں اور بچوں کی خوش حالی کے لئے سوچیں۔ جائیں نماز پڑھیں اور ہم سب کی بھلائی کے لئے اور میرے نیک کام میں ترقی کے لئے دعائیں مانگتے رہیں............"

وہ بولتی جا رہی تھی اور تمام مولوی حضرات سر جھکائے سنتے جا رہے تھے۔ اس کے آگے بولنے کی کسی میں جرأت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس کی تقریر سن کر وہاں سے چلے گئے۔ وہ اپنے ساحلی علاقے کو باقاعدہ فش ہاربر بنا کر' سی فوڈ پروسیسر اور ایکسپورٹرز ایسوسی ایشن وغیرہ قائم کرنا اور کروڑوں روپے کا منافع حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے اس کے پاس کافی دولت تھی مگر وہ اپنے اکاؤنٹ سے ایک پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ ایسی منافع بخش اسکیم تھی کہ حکومت اسے مالی امداد دینے کو تیار ہو جاتی۔ اس مقصد کے لئے اب وہ حکومت کے ان اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقات کرنے والی تھی جو اس کے مطلوبہ شعبے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابھی وہ کچھ تجربہ کار لوگوں کی تلاش میں تھی اور ڈھاکہ

میں باقاعدہ ایک دفتر قائم کرنے کے لئے مناسب جگہ تلاش کر رہی تھی۔

پھر وہ جمعرات آ گئی۔ اسے شام کو چار بجے سے پہلے شہید مرزا کی کوٹھی میں پہنچنا اور ٹرنک کال کے ذریعے فون پر گفتگو کرنا تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ شہید مرزا کس کاروبار کے سلسلے میں گیا ہوا ہے۔ اس کی طویل غیر حاضری سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی بڑا کاروبار کرتا ہے اور اس شاندار کوٹھی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کافی دولت مند ہے اور اس کے موجودہ پروجیکٹ میں معاون و مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر تیج گاؤں میں داخل ہوئی تو اسی راستے سے گزرنا پڑا جہاں وہ دیوانہ اس کے انتظار میں کھڑا رہتا تھا۔ اب وہ ٹھکرایا جا چکا تھا۔ اس لئے وہ نہیں تھا۔ پچھلی جمعرات کو اس کی جگہ صرف وہ گلاب کا پھول مٹی پر کھڑا نظر آیا تھا۔ اس بار زلیخا نے دور ہی سے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا' اب وہاں گلاب کے پھولوں کا ایک اونچا سا مکمل پودا لگا ہوا تھا اور اس پودے میں چار پانچ گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

وہ دل میں بولی۔ "پاگل کا بچہ! مجھے نادان لڑکی سمجھتا ہے اور یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ جس پھول کو ٹھکرایا گیا تھا اب وہ ایک نہیں رہا۔ کئی گلاب کھل گئے ہیں۔ میں کتنے گلابوں کو ٹھکراؤں گی۔ بھلا کبھی ایسا ہوا ہے کہ ایک ہفتے میں وہ ایک پھول اتنا بڑا پودا بن جائے اور اس میں کئی پھول کھل جائیں؟"

کار وہاں سے گزر گئی۔ اس نے سوچا' واپسی پر اپنے بابا کے اس شہید مینار پر پھولوں کا ہار ڈالے گی۔ ابھی تو اس شہید مرزا سے گفتگو کرنے کی بے چینی تھی جو اس کے بابا کا عقیدت مند تھا۔ چوکیدار نے بڑے سے مین گیٹ کو کھول دیا۔ اس کی کار احاطے کے اندر آ کر رک گئی۔ چوکیدار نے گیٹ کو بند کرتے ہوئے کہا۔ "آپ تشریف لائیں۔ اس کوٹھی کے دروازے آپ کے لئے کھلے ہیں۔"

وہ احاطے میں باغیچہ دیکھ رہی تھی اور حیرانی سے گلاب کے کئی پودوں کو دیکھ رہی تھی۔ تمام پودوں کی سبز پتیاں ترو تازہ تھیں' ان کی ہر شاخ پر کانٹے بھی تھے جن کے ساتھ گلاب کے پھول ہوتے ہیں لیکن کسی بھی پودے میں ایک بھی گلاب کا پھول نہیں تھا۔ صرف کانٹے ہی کانٹے تھے۔

اس نے چوکیدار سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے۔ تمام پودے بالکل ترو تازہ ہیں۔ سبز پتیاں بھی ہیں لیکن ایک بھی گلاب کا پھول کسی بھی پودے میں نہیں ہے۔ صرف کانٹے نظر

آرہے ہیں۔"

وہ کوٹھی کی طرف چلنے لگے۔ چوکیدار نے کہا۔ "مالک کو کانٹے پسند ہیں۔ انہوں نے حکم ہے کہ کسی بھی پودے میں پھول نہ کھلے۔ کلیاں نمودار ہوں تو انہیں کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ اس لئے میں صرف کانٹے رہنے دیتا ہوں۔ گلاب کی کلیوں کو کاٹ کر پھینک دیا کرتا ہوں۔"

وہ کوٹھی کے دروازے پر آکر رک گئی پھر بولی۔ "یہ تو عجیب سی بات ہے۔ آج تک نہ دیکھا نہ سنا کہ کوئی کانٹوں سے پیار کرتا ہو اور پھول کو کھلنے نہ دیتا ہو۔ یہ تو قتل ہے..........."

اس نے چوکیدار کی موجودگی میں زبان سے نہیں کہا۔ مگر دل میں کہا "یہ تو سراسر بے رحمی ہے۔ حالانکہ قتل کا عمل ہی بے رحمی کے باعث ہوتا ہے لیکن یہ تو بے رحمی کی انتہا ہے کہ پھول کے حسن کو پھلنے اور اس کی خوشبو پھیلنے سے پہلے ہی فنا کر دیا جائے۔ و شخص کتنا بدصورت اور بدسیرت ہوگا جو خوب صورت سی کلی کے نمودار ہوتے ہی اسے شاخ سے کاٹ کر پھینک دیتا ہے؟"

وہ اندر ہی اندر بری طرح الجھ گئی۔ جس شخص کو دیکھے بغیر دل ہی دل میں اس کی تعریف کرتی رہتی تھی اور جس سے باتیں کرنے کے لئے پچھلی جمعرات سے یعنی پورے آٹھ دن سے انتظار کر رہی تھی کہ کتنی محبت اور عقیدت سے اپنے جذبات کا اظہار کرے گی۔ اپنے بابا کو تاقیامت زندہ رہنے والے شہید کی حیثیت سے منظرِ عام پر لا کر جو احسان اس نے کیا ہے' وہ فون پر اس احسان کو کبھی نہ بھولنے کی قسم کھائے گی۔ اس کوٹھی کے اندر پہنچنے تک اس کے سارے جذبے سرد پڑ گئے تھے۔ آدمی اپنے عمل سے کبھی پہچانا جاتا ہے اور کبھی نہیں پہچانا جاتا۔ اس نے پھولوں کو قتل کرنے والے کی بے رحمی کو سمجھ لیا تھا' کہ اسے دیکھے بغیر اس کی درندگی کو پہچان لیا تھا لیکن جو شخص اس کی محبت میں پھول کھلا رہا تھا اسے نہیں پہچان رہی تھی۔ وہ اسے اس لئے نہیں پہچان رہی تھی کہ وہ سڑک چھاپ تھا' اس کی گاڑی کے نیچے آنے والے کیڑے مکوڑے جیسا تھا۔

ڈرائنگ روم میں قالین بچھا ہوا تھا۔ قیمتی صوفے تھے۔ دیواروں پر مشہور و معروف مصور زین العابدین کے بنائے ہوئے بھوکے بنگال کے خاکے فریم کر کے لگائے گئے تھے۔ ایک طرف شیلف میں معروف و مقبول شاعر نذرالاسلام کی کتابیں تھیں۔ پورے

ڈرائنگ روم سے بنگال کی تہذیب جھلک رہی تھی اور شہید مرزا کے اعلیٰ ذوق اور بنگال سے بے انتہا محبت کی عکاسی کر رہی تھی۔

ابھی چار بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ وہ وقت گزارنے کے لئے کوٹھی کے اندر مختلف حصوں کو دیکھتی رہی۔ اس کی غیر موجودگی میں بھی کوٹھی کی ہر چیز اتنی صاف ستھری تھی کہ اس کے مالک کے صاف ستھرے ذہن کو پیش کر رہی تھی۔ وہ ایک بیڈ روم میں آئی تو دیوار پر اپنے بابا کی بڑی سے تصویر دیکھ کر دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ تصویر کسی مصور نے بنائی تھی۔ پلنگ کے پائنتی جو دیوار تھی اس پر اس تصویر کو آویزاں کیا گیا تھا۔

ایک طرح سے یہ بات قابلِ اعتراض تھی کہ وہ جدھر پاؤں کر کے سوتا تھا' ادھر اس کے بابا کی تصویر لگائی تھی۔ یعنی سونے کے وقت سے صبح جاگنے کے وقت تک وہ تصویر کو لات دکھاتا رہتا تھا لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے اپنے نظریے اور عقیدت سے پہچانی جاتی ہیں۔ اس نے تصویر کو اس لیے پیروں کی طرف دیوار پر لگایا تھا کہ بستر پر لیٹتے وقت نظریں تصویر پر پڑتی تھیں۔ وہ لیٹ کر نیند آنے تک اس کے بابا کو دیکھتا ہوگا۔ پھر صبح آنکھ کھلتے ہی ان کا دیدار کرتا ہوگا۔ گویا محبت اور عقیدت سے بھی بڑھ کر پوجا کرتا ہوگا۔

زلیخا نے اپنے ڈرائنگ روم میں بابا کی تصویر لگائی تھی حالانکہ اسے بھی اپنی خواب گاہ میں تصویر کو لگانا چاہئے تھا۔ اس معاملے میں شہید مرزا' اس شہیدِ اعظم حبیب الرحمان سے محبت کرنے میں اس کی سگی بیٹی سے بھی بازی لے گیا تھا۔

باہر باغیچے میں گلاب کے پودوں کے پاس جو کانٹے زلیخا کے دل میں چبھ رہے تھے اب ان کی تمام چبھن دور ہو گئی تھی۔ اب تو شہید مرزا کے لئے محض عزت ہی نہیں' محبت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ دل کی دھڑکنوں میں سُر سنگیت پیدا کرنے والی محبت محسوس ہونے لگی تھی۔

دور سے فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ چوکیدار ریسیور کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔ "سلام صاحب جی' ہائیں جی۔ بیگم صاحبہ اسے کھنے آچھین' بیگم صاحبہ یہاں ہیں۔"

اس نے زلیخا کو قریب آتے دیکھا۔ "اپئ لین۔ اینار سنگے کو تھا کو این" (یہ لیجئے ان کے ساتھ گفتگو کریں)

زلیخا نے اس سے ریسیور لے کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہیلو آپنی کے؟" (آپ کون ہیں؟)

وہ بولی۔ "میں زلیخا بول رہی ہوں۔ آداب!"

"آداب۔ میں شہید مرزا بول رہا ہوں۔ مگر اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں ایک شہیدِ اعظم کی بیٹی سے ہم کلام ہو رہا ہوں۔ اور سنائیں آپ خیریت سے ہیں؟"

وہ بولی۔ "جی ہاں آپ بھی میرے بابا کی طرح عظیم ہیں اس لئے مجھے آپ نہیں تم کہیں۔"

"دیکھئے، محبت اور عقیدت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ عقیدت سے آپ کہا جاتا ہے اور محبت سے تم کہہ سکتے ہیں۔ میں عقیدت سے بول رہا ہوں۔ آپ محبت سے بولنے کا حوصلہ دے رہی ہیں۔"

اس کے سینے میں پہلی بار محبت کے حوالے سے دل دھڑکنے لگا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ جواب کیا دینا چاہئے۔ وہ بولا۔ "یہ خاموشی کیوں ہے؟ فون تو ٹھیک ہے؟ میری آواز سنائی دے رہی ہے؟"

"جی ہاں صاف آواز آ رہی ہے۔ میں نے یہ کوٹھی اندر سے دیکھی ہے۔ ایک بیڈروم میں اپنے بابا کی تصویر دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے، میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عقیدت کی ایسی انتہا میرے بابا سے آپ.......... آ.......... آپ کو.......... میرا مطلب ہے تمہیں میرے بابا سے اتنا گہرا لگاؤ ہے کہ.........."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "اتنا ہی گہرا لگاؤ تم سے ہے۔"

یہ بات دل کو اچھی لگی۔ اس سے پہلے کی تمام باتیں کانوں کو اچھی لگ رہی تھیں۔ دل کو اس کا تم کہنا اچھا لگا۔ اس کی جاگیر میں اسّی اور سو برسوں کے بوڑھے بھی اسے تم کہنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ سرکاری عہدیدار اور امیر کبیر لوگ بھی اسے آپ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس کا مزاج بھی ایسا تھا کہ وہ خود کو کسی سے کمتر سمجھتی ہی نہیں تھی لیکن سینے میں ایک عورت کے دل کی دھڑکنیں تھیں۔ ہزار برتری کے باوجود ایک عورت کسی ایک مرد سے اس حد تک متاثر ضرور ہوتی ہے کہ اس سے کمتر ہونا نہ سہی مگر کچھ کچھ کم ہونا پسند کر لیتی ہے۔ آدمی جب تک زمین پر ہے اسے سر پر ایک آسمان چاہئے۔

اب زلیخا کا بھی دل چاہنے لگا تھا کہ وہ زمین بن جائے اور اسے آسمان کی طرح اوڑھ لے۔ وہ بولی۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ تم سے جلد ملاقات ہو۔ میں تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں کہ تم میرے بابا سے اتنی زیادہ عقیدت کیوں رکھتے ہو اور تم نے ان کے لئے اتنی جدوجہد کی ہے کہ حکومت کے اعتراضات کے باوجود ان کے نام پر ایک شہید مینار بنا دیا۔"

"میری یہ جدوجہد ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ میں یہاں کراچی صرف بزنس کے لئے نہیں آیا ہوں بلکہ حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے اس بات کے لئے فائٹ کر رہا ہوں کہ سرکاری طور پر تمہارے بابا کو ایک شہید تسلیم کیا جائے۔"

"ہاں میں لندن آنے کے بعد یہی دیکھ رہی ہوں کہ جو بنگالی اپنی بھاشا کے حقوق کے لئے لڑتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں، انہیں حکومت باغی قرار دیتی ہے۔ ان کی یادگار قائم کرنے کی اجازت اس لئے نہیں دیتی کہ ان یادگاروں کو دیکھ کر ہم بنگالیوں میں اپنی بھاشا کے لئے اور پوربو پاکستان میں ترقیاتی کاموں کے لئے اور زیادہ تحریک پیدا ہو گی۔"

"ہاں۔ وہ ہماری تحریک کو کچلنے کے لئے تمہارے بابا کو شہید تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ باغی کہتے ہیں لیکن میں ساری دنیا سے منوا کر رہوں گا کہ تمہارے بابا کو باغی نہیں شہید کہلانا چاہئے۔"

"میں تمہارے اس جذبے کو سلام کرتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری جدوجہد میں ہمیشہ ساتھ رہوں گی۔"

"ایک جوان مرد عورت کو ہمیشہ ساتھ رہنے کے لئے مذہب اور قانون سے سرٹیفکیٹ لینا پڑتا ہے۔"

"ہم ضرور لیں گے۔ خواہ وہ کیسا ہی سرٹیفکیٹ.........." وہ بولتے بولتے رک گئی۔ فوراً سمجھ میں آ گیا کہ وہ نکاح نامے کی بات کر رہا ہے۔ وہ ذرا مسکرائی۔ پہلی بار ذرا شرماتی ہوئی بولی۔ "تم کب آ رہے ہو؟"

"آئندہ جمعرات کو جب تم یہاں آؤ گی تو آج کی طرح مجھے صرف سنو گی نہیں، اپنے روبرو دیکھ بھی سکو گی۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں بڑی بے چینی سے جمعرات کا انتظار کروں گی۔"

"زیادہ شدت سے انتظار نہ کرو۔ اگر میں تمہیں پسند نہ آیا تو؟"

"ایسی بات نہ کرو۔ کیوں پسند نہیں آؤ گے۔ کیا تم میں کوئی عیب ہے؟"

"شاید ہزاروں میں کوئی ایک ہوتا ہے جو اپنے اندر کے عیب کو سمجھ پاتا ہے۔"

"میں اندر کی نہیں باہر کی بات پوچھ رہی ہوں' کیا جسمانی عیب ہے؟ ایک عورت اپنے جوڑے میں پھول لگاتی ہے کانٹے کبھی نہیں.........." بات ادھوری رہ گئی۔ اسے یاد آیا کہ ابھی اس نے باغیچے میں گلاب کے پھول نہیں کانٹے دیکھے ہیں اس نے فوراً ہی کہا۔ "میں نے تمہارے باغ میں گلاب نہیں دیکھے' صرف کانٹے دیکھے ہیں۔ کیا تمہیں گلاب پسند نہیں ہیں؟"

"تم سوچ رہی ہو گی کہ میں ظالم ہوں۔ پھول کھلنے نہیں دیتا۔ اسے کھلنے سے پہلے فنا کر دیتا ہوں۔"

"ایک میں نہیں' کوئی بھی یہ سوچ سکتا ہے۔"

"ہاں جب تک کسی غیر متوقع عمل کا سبب معلوم نہ ہو دیکھنے اور سننے والا غلط رائے قائم کر سکتا ہے۔ مجھے دنیا والوں کی پروا نہیں ہے لیکن جب بھی کوئی میرے باغ میں آکر سبب پوچھتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ گلاب سے زیادہ خوب صورت پھول شہادت ہے۔ ایک شہید کا نام قیامت تک پھول کی طرح کھلتا اور خوشبو پھیلاتا ہے۔ لہٰذا جب تک یہ حکومت شہید حبیب الرحمان کو قیامت تک کھلنے اور خوشبو پھیلانے والا شہید اعظم تسلیم نہیں کرے گی تب تک میں اپنی کوٹھی کے احاطے میں ایک بھی پھول نہیں کھلاؤں گا۔ اسی لئے میرے باغ میں ہریالی ہے پھول نہیں ہیں۔"

وہ بول رہا تھا اور یہ سن کر سحر زدہ ہو رہی تھی۔ پہلے وہ پھولوں کے قتل کو ایک ناپسندیدہ عمل کہہ رہی تھی' اس قاتل کو بے رحم سمجھ رہی تھی لیکن وہ تو اس کے بابا کے لیے احتجاجاً ایسا کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "وہاں میرے ایک کمرے میں بہت سے اخبارات ہیں۔ میں نے ان میں اپنے اس باغ کی تصویریں شائع کرائی ہیں اور بیان دیا ہے کہ جب تک شہادت کے پھول حکومت کھلنے نہیں دے گی میرے باغ میں احتجاج کے طور پر پھول نہیں کھلیں گے۔ صرف کانٹے رہیں گے کیونکہ ہماری بنگالی اکثریت کو کانٹوں میں گھسیٹا جا رہا ہے۔"

وہ سحر زدہ سی ہو کر بولی۔ "بائی گاڈ! آپ جائز حقوق کے سچے علمبردار ہیں۔ میرے بابا

کی خاطر حکومت سے ٹکر لے رہے ہیں۔ آپ میرے آئیڈیل ہیں اور میں اپنے آئیڈیل کے ساتھ ہی زندگی گزاروں گی اور بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کرتی رہوں گی۔"

"تم مجھے پھر آپ کہہ رہی ہو۔"

"آپ اتنے عظیم ہیں کہ میرے اندر بے اختیار آپ کے لئے احترام کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ مجھے ہمیشہ تم کہیں لیکن میں زبان سے نہیں' دل کی اور روح کی گہرائیوں سے آپ کو آپ ہی کہتی رہوں گی۔"

فون پر لمبی گفتگو نہیں ہو سکتی تھی اور دل تھا کہ گفتگو سے ہی زندگی کی دھڑکنیں پا رہا تھا۔ بہرحال فون بند ہو گیا۔ انتظار شروع ہو گیا۔ ایک بے چینی سی تھی کہ جانے وہ دیکھنے میں کیسا ہو گا۔ ویسے اس نے باتوں ہی باتوں میں معلوم کر لیا تھا کہ اس میں کوئی جسمانی عیب نہیں تھا اور اونچی سوسائٹی میں ایک دوسرے کی اسمارٹنس کو اوپر ہی سے دیکھا جاتا ہے۔ باقی جو عیوب اندر ہوتے ہیں' انہیں اندر ہی رکھا جاتا ہے۔ یہی دستور ہے کہ دلکش اور تیز پرفیوم کے پیچھے پسینے کی بُو چھپائی جاتی ہے۔

☆======☆======☆

شہید مرزا ایک ایزی چیئر پر ٹیلی فون کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ فون کے پیچھے اس کی زلیخا کی آواز گم ہو گئی تھی۔ اب وہ اس کی رس بھری آواز نہیں سن سکتا تھا مگر سامنے میز پر اس کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ وہ تصویر تقریباً دس برس پہلے کی تھی جب وہ تعلیم حاصل کرنے لندن جا رہی تھی۔ اس وقت وہ دھان پان سی تھی۔ جوان نہیں تھی کیونکہ سمندر پار جا رہی تھی اور وہ اٹھارہ برس کا تھا۔ عشق و محبت کی باتیں سمجھنے لگا تھا۔ شاید اسے کسی حسین ہم عمر لڑکی سے محبت ہو جاتی لیکن ایک روز اس کی ماں ارجمند بانو نے اس سے پوچھا۔ "بیٹے! تمہیں زلیخا کیسی لگتی ہے؟"

حبیب الرحمان جب بھی ڈھاکا شہر آتا تھا تو تیج گاؤں سے گزرتے ہوئے اس کی بیوہ ماں ارجمند بانو سے ضرور ملاقات کرتا تھا اور کئی گھنٹے اس کے ہاں گزار کر جاتا تھا۔ کبھی کبھی اپنی بیٹی زلیخا کو بھی ساتھ لے آتا تھا۔ زلیخا کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد حبیب الرحمان نے ارجمند بانو سے محبت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ بانو پہلے اس سے کتراتی تھی کیونکہ سمجھ دار تھی کہ حبیب الرحمان خاصا دولت مند جاگیردار ہونے کے باوجود اس بیوہ کی دولت اور جائداد کو بھی محبت سے اپنانا چاہتا ہے اور محبت سے اپنانے کے لئے اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

ارجمند بانو تیج گاؤں کے چوراہے سے لگی ہوئی بارہ ہزار گز کی زمین کی مالکہ تھی۔ پھر تیج گاؤں کے اندرونی علاقوں میں پٹ سن کے چھ بڑے بڑے گودام تھے۔ ان گوداموں کے ساتھ ایک فیکٹری بھی تھی جہاں پٹ سن کی کوالٹی کی درجہ بندی ہوا کرتی تھی۔ پھر اعلیٰ کوالٹی کا پٹ سن بیرونی ممالک روانہ کیا جاتا تھا۔ جہاں تک دولت اور جائداد کا تعلق تھا' وہ حبیب الرحمان سے برتر تھی۔

وہ اپنی کمتری اور اس کی برتری ختم کرنا چاہتا تھا اور یہ ہاتھ سے ہاتھ اور دل سے دل ملانے سے ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے بانو کو سمجھایا۔ "ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ بیٹے کی ماں ہو مگر ماں نہیں لگتی ہو۔ تمہیں دیکھنے سے یوں لگتا ہے جیسے تمہاری شادی ابھی تک نہیں

ہوئی ہے۔"

عورت کی عمر جتنی کم کرو' اتنی ہی وہ خوش ہوتی ہے۔ آئینہ تو عورت کو کبھی اس کی ڈھلتی ہوئی جوانی نہیں دکھاتا۔ ایسے میں کسی مرد کی زبان گواہی دے کہ وہ کم عمر ہے تو وہی سچا قرار پاتا ہے۔ عقل جھوٹی پڑ جاتی ہے۔

(اکثر لوگوں کو اپنی موت اور بڑھاپے کا یقین نہیں ہوتا۔ وہ جلدی مرنے کا سوچتے ہی نہیں۔ ان کا اعتماد کہتا ہے کہ وہ اپنی عمر کی سنچری ضرور کریں گے اور جوانی جب بھی آگے سفر کرتی ہے تو بڑھاپے کی طرف نہیں' سبز باغ کی طرف کرتی ہے۔)

بانو رفتہ رفتہ میں شیشے اترنے لگی۔ اس کے سامنے اٹھارہ برس کا جوان بیٹا تھا۔ دل میں ممتا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن جوانی تو انگ انگ میں بھری ہوتی ہے۔ پھر عمر کا حساب بھی یہ تھا کہ وہ سترہ برس کی عمر میں پہلی بار دلہن بنی تھی۔ وہ اپنی شادی اور بیٹے کی عمر ملا کر زیادہ سے زیادہ چھتیس برس کی ہوگی اور یہ برس بڑھاپے کے نہیں ہوتے' جوانی کھینچ تان کر لانے اور عمر رفتہ کو آواز دینے کے ہوتے ہیں۔

حبیب الرحمان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بانو کے شوہر نے اپنی موت سے قبل دولت اور جائداد کے تین حصے اپنے بیٹے شہید مرزا کے نام لکھ دیئے تھے۔ باقی ایک حصہ بانو کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ بانو بے شک حبیب الرحمان کی طرف مائل ہو گئی تھی لیکن جائداد کا اپنا حصہ بھی بیٹے کو ہی دینا چاہتی تھی۔ ایک تو ممتا کا تقاضا یہی تھا دوسرے یہ کہ وہ جائداد اس کے بیٹے کے باپ کی ہی تھی اس لئے اسے ہی حقدار بنانا چاہتی تھی۔

اس نے یہ بات حبیب الرحمان کو نہیں بتائی تھی کیونکہ اس نے بھی ایسی کوئی بات نہیں چھیڑی تھی۔ پہلے تو محبت کا چارا ڈال رہا تھا۔ محبت میں پختگی اور عورت کے ارادے میں شکستگی آنے کے بعد لین دین کی بات شروع ہوتی ہے۔

بیوگی کی ابتدا میں عورت اپنے مرحوم شوہر کی یادوں اور اس کی اولاد کو دل کی دھڑکنوں سے لگائے رکھتی ہے۔ شوہر کی موت کے بعد چار چھ برس تک کئی رشتے آئے لیکن اس نے دوسری شادی سے انکار کر دیا۔ رشتہ لانے والیوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے پر سوتیلا باپ مسلط نہیں کرے گی۔ اس کے مسلسل انکار اور بیٹے کے حوالے سے ممتا کی پختگی نے یہ خیال قائم کر دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کبھی نہیں کرے گی۔

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ مچھلیاں زیادہ کھانے کے باعث بنگال کی آبادی میں

اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ خاص طور پر ہلسا مچھلیاں بہت لذیذ ہوتی ہیں۔ ان مچھلیوں کو غیر بنگالی بمشکل کھاتے ہیں کیونکہ اس کے گوشت کے ریشے ریشے میں کانٹے ہوتے ہیں۔ بنگال کے لوگ اسے کانٹوں سمیت چبا کر کھایا کرتے ہیں۔ ویسے تو تمام مچھلیوں کی تاثیر گرم ہوتی ہے لیکن ہلسا مچھلیوں کا زیادہ استعمال زیادہ لذت' زیادہ حرارت اور زیادہ تحریک کا باعث ہوتا ہے۔ ایسی تحریک سے چودہ برس والے ہڑبڑا کر اٹھارہ بیس برس کے ہو جاتے ہیں۔ بڑھاپے کی طرف جانے والوں کو بریک لگ جاتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ بڑھاپے میں شراب پی لی جائے تو اچھا ہے غم غلط ہوتا ہے لیکن ہلسا نہ کھائی جائے' بڑھاپے کی جھکی ہوئی کمر سیدھی الف ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگال میں خاندانی منصوبہ بندی کا سرکاری پروگرام ناکام رہتا ہے۔ اس ناکامی کی دوسری وجہ وہاں کی غربت ہے۔ درجنوں اقسام کی مچھلیاں مفت پکڑی جاتی ہیں یا نہایت سستی ہوتی ہیں۔ (سابقہ) مشرقی پاکستان کے ہر پچیس یا پچاس میل پر دریا اور ندی نالے ہیں۔ ان میں مچھلیاں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ تقریباً ستر فیصد بنگالی صبح ناشتے میں' دوپہر اور رات کے کھانوں میں چاول کم اور مچھلیاں زیادہ پکاتے ہیں۔ جن گھروں میں اناج نہیں ہوتا فاقے ہوتے ہیں وہاں تالابوں سے پکڑی ہوئی مچھلیاں کھائی جاتی ہیں۔ جن دنوں پاکستان میں بنگالیوں نے الیکشن میں اکثریت حاصل کی تھی اس میں سراسر مچھلیوں کی سرگرمیاں تھیں۔ مجیب صاحب اور بھٹو صاحب علیحدگی نہیں چاہتے تھے۔ یہ تو مچھلیوں نے سیاسی بیان دیا تھا کہ ہر الیکشن میں پوربو پاکستان کی آبادی بڑھتی ہی جائے گی لہٰذا اُدھر تم رہو اور اِدھر ہم.......... اِدھر وہ ملک و قوم کی خاطر قربان ہوئے اُدھر یہ شہید ہوئے۔

حبیب الرحمان کا ارادہ ہرگز شہید ہونے کا نہ تھا۔ وہ شہیدِ ملت تو کیا' شہیدِ محبت بھی کہلانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لئے تو ارجمند بانو کی دولت اور جائداد کا اندازہ کیا تھا۔ تیج گاؤں میں مچھلیوں کا ہاٹ (بازار) جہاں بنا ہوا تھا وہاں کی زمین بانو کی تھی اور اس ہاٹ میں حبیب الرحمان کے دریا سے پکڑی ہوئی مچھلیاں بھی لائی جاتی تھیں۔ جب اس نے وہ ہاٹ کرائے پر حاصل کیا تب پتا چلا کہ وہاں کی زمینوں کی مالکہ ایک بیوہ ارجمند بانو ہے۔

اس نے رفتہ رفتہ اس کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اس کے دونوں پلڑے بھاری تھے' وہ خوب صورت بھی تھی اور حبیب الرحمان سے زیادہ مال دار بھی تھی۔ اس بیوہ نے زمینوں سے لے کر جوٹ گوداموں اور پٹ سن کی درآمدات کا تمام کام سنبھالا ہوا

تھا۔ حبیب الرحمان نے اپنی بیٹی زلیخا کو تعلیم کے لئے سمندر پار بھیجنے کا ارادہ کیا ہوا تھا اور اس نقطۂ نظر سے سوچتا تھا کہ بیٹی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ماڈرن اور اسمارٹ بن کر آئے گی تو وہ ضرور شہری زندگی گزارنے کو ترجیح دے گی۔ ڈھاکا سے پچاس میل دور پھول باڑی کی مالکہ بن کر وہ خواہ کتنی ہی دولت مند رہے۔ پھر بھی پسماندہ عوام کے درمیان رہے گی اور یہ بات زلیخا کے مزاج اور مرتبے کے بالکل برعکس تھی۔ وہ اکلوتی بیٹی کو بیٹے کی طرح چاہتا تھا اور اس کے لئے بہت کچھ کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

اور جب کچھ بھی کر گزرنے کے لئے ایک خوب صورت اور مالدار بیوہ کو حاصل کرنے کا چانس ہو تو پھر وہ کوشش کیوں نہ کرتا۔ اس نے مچھلی ہاٹ کا پیشگی کرایہ ادا کرنے کے لئے ارجمند بانو سے ملاقات کی۔ وہ بہت کم بولتی تھی صرف کرایہ وغیرہ وصول کرنے کے لئے سامنے آتی تھی۔ پھر کوئی بات رہ جائے تو دوسرے کمرے میں جا کر گویا پردہ کرتی تھی اور باقی باتیں کرتی تھی۔

مچھلیاں تو پانی کی تہہ میں چھپتی ہی ہیں' انہیں باہر نکالنا پڑتا ہے۔ اس نے پھر اسے روبرو لانے کے لئے کہا۔ "مچھلی ہاٹ چاروں طرف سے کھلا ہوا ہے' اوپر صرف بانسوں کی چھت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہاں ہر دکاندار کے لئے سہ دیواری اور سامنے والا حصہ گاہکوں کے لئے کھلا ہو۔"

وہ دوسرے کمرے سے بولی۔ "ہر دکان کے تینوں طرف بانس کی دیوار بنوانے میں رقم خرچ ہوگی اور میں رقم خرچ کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔"

"رقم تو میں خرچ کروں گا اور بانسوں کی نہیں پکی اینٹوں کی دیواریں اور چھت بنواؤں گا تاکہ دکانداروں اور گاہکوں کو دھوپ میں جلنا اور بارش میں بھیگنا نہ پڑے۔"

وہ بولی۔ "میں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ آپ اس تعمیراتی کام کے لئے میرے کرائے میں سے رقم کاٹتے رہیں گے۔"

"بالکل نہیں۔ یہ تمام رقم میں اپنے اکاؤنٹ سے خرچ کروں گا۔ نہ آپ سے ایک ٹاکا مانگنے آؤں گا اور نہ ہی مالکانہ حقوق کا دعویٰ کروں گا' آپ اس سلسلے میں مجھ سے معاہدہ کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں۔"

وہ حیران ہو کر دوسرے کمرے سے نکل آئی۔ اس کے سامنے آکر بولی۔ "آپ میرے مچھلی ہاٹ کے لئے نہ جانے کتنی رقم خرچ کریں گے اور مجھ سے ایک ٹاکا بھی نہیں

لیں گے؟ مگر کیوں؟ یہ مجھ پر مہربانی کیوں کریں گے؟"

"میں آپ پر مہربانی نہیں کروں گا بلکہ اپنا کاروبار اور منافع بڑھاؤں گا۔ آپ تنہا خاتون ہو کر اپنے ڈھنگ سے اپنا کاروبار سنبھال رہی ہیں۔ میں آپ کو دکھاؤں گا کہ کاروبار میں منافع کس طرح کئی گنا بڑھایا جاتا ہے۔ آپ صرف منافع کے ایک پہلو پر غور نہ کریں۔ اگر میں ہر دکاندار کو پکی دیواریں اور پکی چھتیں دوں گا اور انہیں دھوپ اور بارش سے بچاؤں گا تو کیا وہ مجھے ہر دکان کا دگنا کرایہ نہیں دیں گے؟"

"یہ میں بعد میں سمجھوں گی' آپ تعمیر سے پہلے پکے کاغذ پر لکھ کر دیں کہ آپ ان پکی دکانوں کے درودیوار پر مالکانہ حقوق کا دعویٰ نہیں کریں گے۔"

اس نے دوسرے دن لکھ کر دے دیا اور پکی دکانوں کی تعمیر شروع کرا دی۔ دن رات ٹھیکدار اور مزدوروں سے کام کرایا۔ ایک ماہ کے بعد جب اس مچھلی مارکیٹ کا کاروبار شروع ہوا تو واقعی دکانداروں نے ہر دکان کا دگنا کرایہ دیا۔ منافع دگنا ہو گیا پھر تیج گاؤں سے ڈھاکا کے تمام مچھلی بازاروں تک یہ شہرت پہنچ گئی کہ ارجمند بانو نے جدید طرز کا مچھلی ہاٹ تعمیر کرایا ہے۔

بانو نے ایک دکان کا کرایہ پچیس روپے ماہانہ طے کیا تھا۔ وہ سستے کا زمانہ تھا۔ پچیس روپے بہت زیادہ سمجھے جاتے تھے لیکن زیادتی کے باوجود ہر دکاندار نے پچاس روپے ادا کیا۔ یہ کرایہ اس نے بانو کو پیش کیا۔ بانو نے کہا۔ "میں نے ماہانہ پچیس روپے طے کیا تھا۔ آپ پچاس روپے کے حساب سے کیوں دے رہیں ہیں؟"

"اس لئے کہ ایگریمنٹ کے مطابق آپ ان دکانوں کی مالکہ ہیں اور میں نے پکے کاغذ پر لکھ دیا ہے کہ میں مالکانہ حقوق کا دعویٰ نہیں کروں گا۔ لہٰذا ان دکانوں سے جو حاصل ہو گا وہ آپ کا ہو گا۔ اگر آپ مجھے دینا چاہیں گی تو پھر ہم دونوں ان دکانوں کے مشترکہ مالک ہوں گے۔"

"آپ عجیب انسان ہیں۔ دکانیں آپ نے اپنی رقم سے تعمیر کرائیں لیکن میرے نام کا ڈنکا پیٹ دیا کہ میں نے ایک جدید مچھلی مارکیٹ تعمیر کرائی ہے۔ ہر جگہ میرا ہی نام ہو رہا ہے' آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"ایسا تو کرنا ہی تھا۔ آپ ان زمینوں کی مالکہ ہیں۔ آپ کی زمینوں پر میں تعمیراتی کام کا دعویٰ کیسے کر سکتا تھا؟"

"میں مان گئی' آپ بہت کاروباری سُوجھ بُوجھ رکھتے ہیں۔ میں چاہوں گی کہ مچھلی مارکیٹ کے منافع میں آپ میرے شریک رہیں۔"

"آپ مجھے تجربہ کار سمجھتی ہیں۔ میرا ایک مشورہ یاد رکھیں (اپنے کسی کاروبار میں کسی کو شریک نہ کریں۔ شراکت میں کاروبار کرنے سے ہمیشہ تلخیاں پیدا ہوتی ہیں اور شریکِ کاروبار کسی وقت بھی آستین کا سانپ بن سکتا ہے)"

وہ متاثر ہو کر بولی۔ "آپ بہت اچھی اور تجربات سکھانے والی باتیں کرتے ہیں۔"

"میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا لیکن کاروبار کے کسی بھی چھوٹے بڑے معاملے میں کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے تو آپ مجھے آدھی رات کو بھی بلا کر مشورہ کر سکتی ہیں۔ آپ نے ایک خاتون ہو کر بزنس کے بڑے بڑے پہاڑ اٹھا رکھے ہیں۔ آپ کا یہ بوجھ اگر میں ہلکا کر سکا تو مجھے اتنی خوشی ہو گی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"آپ اتنی اپنائیت سے میرے کام آنا چاہتے ہیں۔ اس کی کوئی کاروباری وجہ ہے؟"

"مجھے یہ فخر ہے کہ ہماری ایک بنگالی خاتون دنیا کی کسی بھی عورت سے کم نہیں ہے آپ بڑے سے بڑا کام خود اعتمادی سے کر سکتی ہیں لیکن جس طرح میں نے ایک مشورہ دیا ہے کہ کبھی کسی کو اپنے کاروبار میں شریک نہ کریں اسی طرح میرا دوسرا مشورہ بھی یاد رکھیں کہ بڑے بڑے حکمرانوں کے پاس کئی مشیر ہوتے ہیں جو مختلف شعبوں میں مہارت رکھتے ہیں اور اپنے حکمرانوں کو معقول مشورے دیتے ہیں۔ بزنس میں بھی آپ کو ایک تجربہ کار مشیر کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے کسی کاروبار میں مجھ سے مشورہ لے کر دیکھیں۔ میں اس کاروبار میں انقلابی تبدیلیاں لا کر اس کا منافع اتنا بڑھا دوں گا کہ آپ اس بات کی قائل ہو جائیں گی کہ (عورت میں خواہ کتنی ہی خود اعتمادی ہو' وہ کسی مرد کو پَر بنائے بغیر پرواز نہیں کر سکتی۔)"

اس نے بڑی معنی خیز اور غور طلب بات کہہ دی تھی۔ کاروباری باتوں کی تہہ میں ایک مرد کی کمی کا احساس پیدا کر دیا تھا اور اسے اس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ اب ہر دوسرے تیسرے روز اس سے ملاقات ہونے لگی تھی۔ حبیب الرحمان نے پٹ سن کی برآمدات کے سلسلے میں بھی چند معقول مشورے دیئے تھے اور بیرونی ممالک کو مال ارسال کرنے کے دوران کافی رقم ضائع ہونے سے بچائی تھی۔ وہ پٹ سن نارائن گنج کی جیٹی سے جاتا تھا۔ اس نے وہاں کے اعلیٰ افسران کو رشوت دے کر برآمدات کے اخراجات میں

حیرت انگیز کمی کرا دی تھی۔

بانو اس کی کاروباری ذہانت کی قائل ہو گئی تھی اور ایسی اپنائیت سے پیش آتی تھی جیسے وہ اس کے گھر کا ایک فرد ہو۔ اس کے باوجود حبیب الرحمان نے محسوس کیا تھا کہ وہ سرد جذبات کی حامل ہے۔ شعر و شاعری یا کسی طرح کی جذباتی گفتگو سے پرہیز کرتی ہے۔

اس کا بیٹا شہید مرزا اٹھارہ برس کا تھا۔ دسویں جماعت پاس کر چکا تھا اور اب ڈھاکا کے ایک کالج میں داخلہ لے رہا تھا۔ حبیب الرحمان سے اس کی بھی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایسے ہی وقت اس نے زلیخا کو اپنے بابا کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس سے گفتگو بھی کی تھی۔ ایسے ہی وقت ماں نے اس سے پوچھا۔ "بیٹے! تمہیں زلیخا کیسی لگتی ہے؟"

ماں کے اس سوال نے اس کے سوچنے کے انداز کو بدل دیا۔ وہ صرف نگاہوں سے اچھی لگتی تھی اب دل سے بھی اچھی لگنے لگی۔ ارجمند بانو سوچ رہی تھی کہ حبیب الرحمان بڑے کام کا آدمی ہے۔ اگر اس کی بیٹی کی شادی شہید مرزا سے ہو جائے تو حبیب الرحمان سمدھی بن کر اس کے کاروبار میں معاون و مددگار رہے گا۔ اس نے اپنا خیال اس پر ظاہر کیا تو وہ ذرا گڑبڑا گیا۔ بانو کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "زلیخا ابھی بچی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن جا رہی ہے۔ اس کی واپسی میں کئی برس لگیں گے۔ پھر وہ یورپ کے ماحول سے آزاد طبیعت لے کر آئے گی۔ پتا نہیں وہ ہمارے طے کئے ہوئے رشتے پر راضی ہو گی یا نہیں اور جب آپ نے رشتے کی بات چھیڑ دی ہے تو آپ کو اپنے متعلق غور کرنا چاہئے۔ آپ کو ایک اچھے جیون ساتھی کی ضرورت ہے اور میں آپ کا ایسا ساتھی ثابت ہو رہا ہوں جو اپنا جیون تو ہار سکتا ہے مگر کبھی ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔"

وہ منہ پھیر کر بولی۔ "آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں میرا ایک جوان بیٹا ہے۔"

"میری بیٹی بھی چند برسوں میں جوان ہو جائے گی۔ جب ہم ملیں گے تو ہو سکتا ہے کہ ان کے دل بھی مل جائیں۔"

ابھی ابتدا تھی' وہ کترانے لگی۔ حبیب الرحمان نے کئی داؤ پیچ استعمال کئے۔ وہ اس سے متاثر تو تھی مگر شادی سے انکار کرتی رہی۔ بہت غور کرنے اور توجہ سے سوچنے کے بعد یاد آیا کہ وہ کئی بار اس کے ساتھ لنچ اور ڈنر کر چکا ہے اور ہمیشہ دیکھا ہے کہ وہ بنگالی ہو کر گوشت اور مچھلی نہیں کھاتی ہے۔ ٹھنڈی تاثیر والی غذائیں استعمال کرتی ہے۔ حبیب الرحمان نے اسے مچھلی کی ڈش پیش کی۔ پھر اس کے انکار پر پوچھا۔ "کیوں نہیں کھاتی۔

اسے تو ہماری قومی خوراک کہنا چاہئے۔"

"میں پہلے شوق سے کھایا کرتی تھی۔ اب چھوڑ دی ہے سادہ خوراک اچھی لگتی ہے۔"

"آپ اکثر کہتی ہیں کہ میں آپ کے کاروبار میں ہر طرح کا ساتھ دیتا ہوں لیکن معاوضہ یا منافع آپ سے نہیں لیتا ہوں۔ آج میں معاوضہ مانگ رہا ہوں۔"

"میں ضرور دوں گی۔ بولیں آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"صرف یہ کہ آپ یہ ہلسا کھائیں۔ یہ زہر نہیں ہے۔ میں بھی کھا رہا ہوں۔"

اس نے پہلی بار معاوضے کی بات کی تھی۔ بانو کو مجبور ہو کر کھانا پڑا۔ وہ مچھلی تو پہلے سے منہ کو لگی ہوئی تھی۔ اس نے ایک مدت کے بعد اس کے اصرار پر تھوڑا سا کھانا چاہا تو پھر کھاتی چلی گئی۔ دوسری بار حبیب الرحمان اپنے گھر سے پکوا کر لایا اور اس کے گھر میں بیٹھ کر خود کھایا۔ اسے بھی کھلایا۔ تیسری بار کہا۔ "آپ اپنے ہاتھوں سے پکائیں۔ یہ میری خوشی ہے کہ آپ کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھاؤں۔"

اس نے اس کی یہ خوشی بھی پوری کر دی۔ اس طرح وہ چھوڑی ہوئی چیز منہ کو لگ گئی۔ وہ سمجھ نہیں پائی کہ کیا ہو گیا؟ پہلے آئینہ روبرو ہو گیا۔ اب وہ دیر تک آئینے میں خود کو دیکھنے لگی تھی۔ کبھی چہرے کو کبھی بدن کو گھورنے لگی تھی۔ بدن کی جلد میں کہیں ایک شکن بھی نہیں آئی تھی۔ پھر اس کے لباسوں سے بھولے بھٹکے شوخ رنگ جھلکنے لگے۔

مچھلی کو پکڑنے کے لئے پانی میں کانٹا ڈالا جاتا ہے۔ وہ کانٹا مچھلی کے منہ میں اٹکتا ہے تو وہ الجھ کر پھڑپھڑاتی ہوئی شکاری کے تھیلے میں آتی ہے۔ وہ مچھلی کھانے والی یہ بھول گئی تھی کہ کانٹا صرف مچھلی کے منہ میں نہیں اٹکتا۔ کھانے والوں کے حلق میں اٹک جاتا ہے۔ آخر وہ حبیب الرحمان اس کے حلق میں ہی اٹک ہی گیا۔

ایسا تو ہونا ہی تھا۔ حلق سے اترنے والی مچھلیاں اس کے پیٹ میں پھڑپھڑانے لگی تھیں۔ وہ شادی کے لئے راضی ہو گئی۔ حبیب الرحمان بیٹی کو لندن روانہ کر چکا تھا۔ اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ دوسری شادی کرنے والا اور اس پر سوتیلی ماں لانے والا ہے۔ اس نے سوچا' جب بیٹی بالغ ہو گی اور یورپ کے ماحول میں ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دے گی تو بتائے گا کہ بانو سے شادی کر کے وہ کس طرح شہر میں دولت کی بازی جیتنے والا ہے۔ زلیخا کے چلے جانے سے شہید مرزا کو بہت دکھ پہنچا۔ زلیخا کو محبت کی آنچ بھی نہیں پہنچی تھی

لیکن وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی ماں حبیب الرحمان سے شادی کرنے والی ہے تو اسے بہت برا لگا۔ بیٹا جوان ہو اور ماں دوسرے مرد کی ہونا چاہے تو ایسے میں بیٹے کو شرم بھی آتی ہے۔ اس نے دبی زبان سے اعتراض کیا۔ ماں نے کہا۔ ”میں تمہاری خوشیاں حاصل کرنے کے لئے شادی کر رہی ہوں۔ کیا تم زلیخا سے شادی نہیں کرو گے؟“

وہ انکار نہ کر سکا۔ ماں سے منہ پھیر کر چلا۔ بانو نے حبیب الرحمان سے کہا۔ ”آپ میرے بیٹے کو اعتماد میں لینے کی کوشش کریں ورنہ وہ ماں سے باغی ہو جائے گا۔“

”میں تمہارے بیٹے کو اتنی محبت دوں گا کہ وہ بغاوت بھول جائے گا۔“

”میں یہی چاہتی ہوں۔ آپ ہماری شادی سے پہلے اسے یقین دلائیں کہ زلیخا تعلیم مکمل کر کے آئے گی تو اس سے میرے بیٹے کی شادی کر دی جائے گی۔“

حبیب الرحمان ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو شہید مرزا کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھتا تھا۔ بانو تو بیوہ ہونے کے چھ برس تک شادی سے انکار کرتی رہی تھی۔ پھر حبیب الرحمان نے تین برسوں کی محنت کے بعد اسے شیشے میں اتارا تھا اور اس دوران معلوم کر چکا تھا کہ تیج گاؤں کی جائداد‘ کاروبار اور اس کی آمدنی پر شہید مرزا کا حق ہے۔ اس کے باپ نے مرنے سے پہلے وصیت میں وہ سب کچھ بیٹے کے نام لکھ دیا تھا اور بانو کو جائداد کا تھوڑا سا حصہ دے کر بیٹے کی دولت اور جائداد کا نگراں بنایا تھا۔ پھر شہید مرزا نے بیس برس کا ہونے کے بعد اپنی تمام جائداد اور کاروبار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ چونکہ حبیب الرحمان کو ایک مخلص مشیر سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ بھی اسے مشیر ہی کے طور پر اپنے کاروبار کا راز دار بنائے رکھتا تھا۔ پھر وہ زلیخا کا باپ تھا اس لئے اس کی عزت بھی کرتا تھا لیکن ماں سے اس کی شادی ہو گئی تو وہ پھانس کی طرح اسے چبھنے لگا۔ زلیخا کے عشق نے اس کی زبان بند رکھی تھی اور یہ حقیقت سمجھ میں آرہی تھی کہ عشق بری بلا ہے وہ ماں کو دے کر محبوبہ کو لینے والا ہے۔

اور حبیب الرحمان نے زلیخا سے اس کی شادی کرنے کا جھوٹا وعدہ کیا تھا اور اس موقعے کی تاک میں تھا کہ شہید مرزا کچھ اس طرح موت کے منہ میں جائے کہ وہ موت ایک حادثہ لگے اور اس پر کوئی الزام نہ آئے۔ اس کی موت کے بعد تمام دولت اور جائداد کی مالکہ ارجمند بانو ہو گی۔ یعنی وہ میاں بیوی ہوں گے اور ان کی صرف ایک بیٹی زلیخا ہو گی

جو آئندہ پھول باڑی کے علاوہ تیج گاؤں کی تمام زمین جائداد کی بھی مالکہ ہو گی۔ پھر اپنے معیار اور مرتبے کے مطابق اپنے کسی آئیڈیل سے شادی کرے گی۔

جہاں تک معیار اور مرتبے کا تعلق ہے حبیب الرحمان بانو اور اس کے بیٹے کو کمتر سمجھتا تھا۔ اس نے بڑی دور تک معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ ارجمند بانو پٹ سن کے ایک گودام کے چوکیدار کی بیٹی تھی۔ شہود مرزا کو بانو سے عشق ہو گیا تھا۔ اس لئے اس سے شادی کر کے اسے لاکھوں کروڑوں کی جائداد کی مالکہ بنا دیا تھا۔ شہید مرزا نے اس چوکیدار کی بیٹی کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اس لئے وہ ماں بیٹے کمتر تھے۔ خاندانی نہیں تھے‘ کسی قابلِ فخر شجرے سے نہیں تھے۔ پیروں تلے کی خاک تھے۔ ہوا کے جھونکے سے اڑ کر سر پر آبیٹھے تھے۔ اس لیے وہ شہید مرزا کو اپنی حسین اور اسمارٹ بیٹی کے سر پر آبیٹھنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ موت تو سب کو آتی ہے۔ بیٹے کے بعد کسی دن ماں کو بھی موت آسکتی تھی۔ یوں سر پر چڑھنے والی خاک بالکل ڈھل جاتی اور شہر کی تمام دولت اور جائداد مرحومہ بن جانے والی بانو کے شوہر اور اس کی بیٹی کو مل جاتی۔

ماں نے تو شادی کر لی تھی لیکن بیٹے کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ ماں کے دوسرے شوہر کو باپ سمجھے اور اسے ابا‘ ابو یا ڈیڈی کہہ کر مخاطب کرے۔ مگر جو رشتے داری ہو گئی تھی اس کے مطابق اب وہ اسے حبیب صاحب یا رحمان صاحب نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایسے وقت میں زلیخا کا عشق کام آیا۔ وہ اپنے باپ کو بابا کہتی تھی اس لئے وہ بھی اسے بابا کہنے لگا۔ ایسا کہتے وقت وہ ماں کے شوہر سے دور اور زلیخا سے خود کو قریب سمجھتا رہتا تھا۔

بانو شادی کے بعد کچھ عرصہ پھول باڑی جا کر رہنا چاہتی تھی۔ کاروبار کی فکر نہیں تھی۔ اسے بیٹے نے سنبھالا ہوا تھا۔ ویسے بیٹے سے کہا گیا کہ وہ اپنی ماں کے نئے سسرال پھول باڑی میں ایک دن کے لئے چلے جہاں ماں کو بقیہ زندگی کا زیادہ حصہ گزارنا ہے‘ اس جگہ کو دیکھنا چاہئے لیکن اس نے کاروباری مصروفیات کا بہانہ کیا۔ ماں نے کہا۔ ”وہاں چلو گے تو زلیخا کا کمرا دیکھو گے۔ کمرے میں اس کی پسند کی چیزیں دیکھو گے وہاں اس کی تصویریں بھی ہوں گی۔“

ماں اپنے بیٹے کے دل و دماغ کو خوب سمجھتی تھی۔ محبوب جہاں سے گزر جائے وہاں اس کے پیروں تلے کی مٹی سے بھی محبت ہوتی ہے۔ وہ زلیخا کی چیزوں اور اس کی تصویروں کو دیکھنے پر مائل ہوا لیکن حبیب الرحمان عشق کی آگ پر مٹی ڈال کر بجھانا چاہتا

تھا۔ اس نے کہا۔ "مرزا بیٹے کو ضرور چلنا چاہئے لیکن وہاں زلیخا کی کوئی چیز نظر نہیں آئے گی۔ اس نے لندن جانے سے پہلے اپنی تمام چیزوں کو الماری اور صندوق میں مقفل کر دیا ہے۔ پھر اپنے کمرے کے دروازے پر بھی تالا ڈال دیا ہے۔ چابیاں ساتھ لے گئی ہے۔ وہ ذرا دوسرے مزاج کی لڑکی ہے۔ یہ پسند نہیں کرتی ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں حویلی کے ملازم بھی اس کے کمرے میں قدم رکھیں اور اس کی کسی چیز کو ہاتھ لگائیں۔"

شہید مرزا ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہاں جانے کا شوق بجھ گیا۔ اس نے بہانہ کر دیا پھر کسی دن جائے گا لیکن پھر اس نے کبھی پھول باڑی کا رخ نہیں کیا۔ اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔

بانو اپنے بیٹے کی مایوسیوں کو اور اس کی دوسری شادی کی ناپسندیدگی کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے حبیب الرحمان سے کہا۔ "میرا بیٹا شہر میں تنہا رہ گیا ہے کچھ دل برداشتہ سا ہے اس کے لئے کچھ کریں۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم تو اسے ننھا بچہ بنا کر رکھتی ہو' واقعی بچہ ہوتا تو بازار سے کھلونا لا کر اسے بہلا دیتا۔"

"میں اس کی ماں ہوں۔ وہ میرے لئے ایک ننھا سا بچہ ہی ہے۔ آپ زلیخا اور اس کے درمیان خط وکتابت کرا سکتے ہیں لیکن آپ نے تو ابھی تک میری اور اپنی شادی کی بات بھی بیٹی کو نہیں بتائی ہے۔"

"وہ بڑی ذہین اور ماڈرن ہے۔ ضدی اور خود سر بھی ہے۔ میں لندن جاؤں گا تو اس کے سامنے بیٹھ کر اسے سمجھاؤں گا ورنہ صرف خط لکھ دینے سے وہ ایک سوتیلی ماں کو تسلیم نہیں کرے گی۔"

بانو کو یہ بات بری لگی۔ اس نے کہا۔ "کیا میں ایسی گئی گزری ہوں کہ وہ ایک باقاعدہ ہونے والی شادی کو اور مجھ کو تسلیم نہیں کرے گی؟"

"بات سمجھا کرو۔ وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بلند مرتبے سے نیچے آنا گوارا نہیں کرے گی۔ اسے کبھی نہ کبھی یہ ضرور معلوم ہو گا کہ تم شہود مرزا سے شادی کرنے سے پہلے ایک معمولی چوکیدار کی بیٹی تھیں۔"

بانو نے چونک کر حبیب الرحمان کو دیکھا۔ بہت عرصے بعد وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوئی۔ وہ بولا۔ "مجھے غلط نہ سمجھنا۔ میں نے حسب و نسب اور اعلیٰ خاندان کو نہیں صرف

ہماری صورت اور سیرت کو دیکھا ہے۔ تم تو خوش نصیب ہو کہ تمہیں یہ دوسرا شوہر بھی دولت مند اور خاندانی ملا ہے۔ میں زلیخا سے روبرو گفتگو کر کے اسے قائل کروں گا کہ اب میں نے تمہیں قبول کر لیا ہے تو اسے بھی ضرور قبول کر لینا چاہئے۔"

اندر سے بانو کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ اتنے عرصے تک مالدار بیوہ اور سیکڑوں ملازموں کی مالکہ کہلانے کے باوجود ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں رہنے والے ایک چوکیدار کی بیٹی تھی۔ اس کا خاندانی بیک گراؤنڈ ایسا نہیں تھا جس پر وہ فخر کرتی۔ وہ ٹوٹ کر بولی۔ "مجھے بدترین اور کمترین سمجھیں۔ مگر میرے پہلے شوہر شہود مرزا اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اولاد اپنے باپ سے پہچانی جاتی ہے۔ شہید مرزا ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والے باپ کا بیٹا ہے۔ آپ اور زلیخا تو اسے کمتر نہیں کہیں گے۔"

"یہی باتیں میں لندن جا کر زلیخا کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ تم اطمینان رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اب کیا ٹھیک ہوتا؟ اس نے بہت ہی مالدار مالکہ کہلانے والی کا بھاؤ ایک دم سے گرا دیا تھا۔ اسے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پھول باڑی کی حویلی میں ایک چوکیدار کی بیٹی کی حیثیت سے بیاہ کر آئی ہے۔ اب مالدار بھی نہیں تھی۔ تمام مال اور کاروبار بیٹے کے ہاتھ میں تھا۔ ایک ایسے بیٹے کے ہاتھ میں جس کا باپ خاندانی تھا اور جس کی ماں کم ذات تھی۔

وہ بولی۔ "میں واپس جاؤں گی۔ شہر والی کوٹھی میں رہوں گی۔"

"وہ بولا۔ "ہم دونوں کبھی وہاں اور کبھی یہاں رہا کریں گے۔"

"میں یہاں نہیں آؤں گی۔ جب تک آپ کی بیٹی مجھے ماں تسلیم نہیں کرے گی اور میرے بیٹے کو ایک اعلیٰ خاندان کا فرد تسلیم کر کے اس سے شادی نہیں کرے گی تب تک میں تیج گاؤں والی کوٹھی میں رہوں گی۔"

"تم میرے ساتھ یہاں نہیں آیا کرو گی تو شہید مرزا کیا سوچے گا؟"

"وہ ڈھاکا والی کوٹھی میں رہتا ہے اور ہم سے کتراتا ہے۔ وہ مجھ سے کوئی سوال نہیں کرے گا۔ ویسے میں اسے سمجھاؤں گی کہ وہ زندگی میں کسی چیز کی آرزو شدت سے نہ کرے۔ خواہ وہ زلیخا کے حصول کی آرزو ہی کیوں نہ ہو۔ آدمی نارمل ہو کر کوئی چیز طلب کرے اور وہ چیز نہ ملے تو دل کو زیادہ صدمہ نہیں پہنچتا ہے۔ جتنا صدمہ پہنچتا ہے وہ قابلِ برداشت ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم چلیں گے لیکن دو چار روز ٹھہر جاؤ۔ یہاں کے جوشیلے جوانوں نے مجھے بانگلا بھاشہ کے سیاسی معاملے میں الجھا دیا ہے۔ میں اردو کے خلاف بول کر حکومت کی بلیک لسٹ میں نہیں آنا چاہتا اور بانگلہ بھاشا کے خلاف تو بول ہی نہیں سکتا۔ تمام بنگالی میری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔"

بانو نے کہا۔ "یہ آپ کا معاملہ ہے۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ تیج گاؤں میں ایک مالکہ کی حیثیت سے رہوں گی۔ یہاں میری حیثیت ایک چوکیدار کی بیٹی کی ہے جسے آپ بیاہ کر لائے ہیں۔"

وہ روکنے کے باوجود وہاں سے چلی گئی۔ حبیب الرحمان نے سوچا کہ موجودہ سیاسی دلدل سے نکلتے ہی تیج گاؤں پہنچ کر بانو کو منائے گا۔ اس کے لئے بانو ضروری تھی اس کا بیٹا غیر ضروری تھا۔

وہ تیج گاؤں واپس آگئی۔ بیٹا کاروبار میں مصروف تھا۔ رات کو نہیں آیا۔ دوسرے دن ماں کو دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کب آئیں؟ مجھے معلوم ہوتا تو رات ہی کو واپس آجاتا۔ کیا آپ اکیلی ہیں؟"

"ہاں۔ وہ سیاسی معاملے میں الجھے ہوئے ہیں۔ کچھ روز بعد آئیں گے۔ تم رات کو کیوں نہیں آئے؟"

"میں ڈھاکا والی کوٹھی میں تھا۔"

"بیٹے! میں تمہیں تنہا چھوڑنا نہیں چاہتی۔ میں نے ایک اچھی لڑکی دیکھی ہے تم بھی اسے دیکھ لو۔ وہ پسند آئے تو شادی کر لو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میں صرف زلیخا سے شادی کروں گا۔"

"کسی کو بھی حاصل کرنے کے لئے ضدی نہیں بننا چاہیے۔ اگر زلیخا نے کوئی دوسرا آئیڈیل تلاش کر لیا تو کیا اس کے ہی نام کی مالا جپتے رہو گے؟"

"وہ دوسرا آئیڈیل کیوں تلاش کرے گی؟ کیا مجھ میں کوئی کمی ہے؟"

"بیٹے! وہ خاندانی لوگ ہیں۔ تم بھی ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہو لیکن میں نے تمہیں یہ بتانا کبھی ضروری نہیں سمجھا کہ تمہارے ابا سے شادی کرنے سے پہلے میں ایک چوکیدار کی بیٹی تھی۔ میرا کوئی خاندانی بیک گراؤنڈ نہیں ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ ہر حال میں میری امی ہیں۔ میرے لئے محترم

ہیں۔ رہ گئی نام اور گھرانے کی بات تو اولاد کو نام اور رتبہ باپ سے ملتا ہے۔"

"ہمارے لوگ باپ اور ماں دونوں کی طرف سے شجرہ دیکھتے ہیں۔ زلیخا بھی یہی سوچ کر تمہیں شاید قبول نہ کرے۔"

"یہ آپ پھول باڑی جا کر ایک نیا مسئلہ لے کر آگئی ہیں۔ کیا وہ میرے دوسرے بابا بھی یہی کہتے ہیں؟"

"ہاں کہتے تو ہیں لیکن یقین دلاتے ہیں کہ زلیخا کو تمہارے لئے راضی کر لیں گے۔"

"یہ بات انہوں نے آپ سے شادی سے پہلے کیوں نہیں کہی۔ میں ابھی صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ زلیخا کے بابا کو میں صرف زلیخا کی وجہ سے برداشت کر رہا ہوں۔ اگر وہ مجھے قبول کرنے سے انکار کرے گی تو یہ صرف میری ہی نہیں آپ کی بھی توہین ہو گی۔ اور یہ میں برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی میری ماں کو کسی سے بھی کمتر سمجھے۔"

"بیٹے! جوش میں نہ آؤ۔ خواہ مخواہ بات بگڑ جائے گی۔ رحمان صاحب جلد ہی لندن جا رہے ہیں، وہاں اپنی بیٹی کو تمہارے حق میں سمجھائیں گے۔"

"بات اب میری نہیں، آپ کے حق کی ہے۔ پہلے وہ باپ بیٹی آپ کی برتری یا برابری کو تسلیم کریں گے۔ دولت کمانا کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن عزت کمانے کے لئے پوری عمر گزر جاتی ہے۔ اس لئے پہلے آپ کے احترام اور عزت کی بات ہو گی اس کے بعد میرے اور زلیخا کے رشتے کی بات طے پائے گی۔"

بانو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ جانتی تھی کہ بچپن سے کلیجے سے لگ کر رہنے والا بیٹا اسے کتنا چاہتا ہے۔ ماں کو اتنا مان مرتبہ دیتا ہے کہ اس کی خاطر اس لڑکی کو ثانوی حیثیت دے رہا ہے جس کی تصویر اپنے کمرے کی میز پر رکھتا تھا اور اس کی باتیں اتنے جذبے سے کرتا تھا جیسے زبان سے نہیں دل کی دھڑکنوں سے بول رہا ہو۔ ایک ماں اپنے لئے سب سے بڑا انعام ایسے بیٹے کو سمجھتی ہے جو محبوبہ یا بیوی سے زیادہ اس کی ممتا کو اہمیت دیتا ہے۔

وہ آگے بڑھ کر بیٹے کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنی طرف جھکا کر اسے سینے سے لگا کر رونے لگی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ "آگ لگے میری بُدھی (عقل) کو۔ اتنی بڑی حماقت ہو گئی۔ اگر ذرا سمجھداری سے کام لیتی تو پہلے زلیخا سے تمہاری منگنی کراتی بلکہ نکاح پڑھوا دیتی۔ رخصتی بعد میں ہو جاتی لیکن پہلے میں نے شادی کر لی۔ میرے جیسی

خود غرض ماں کوئی نہیں ہوگی۔"

وہ ماں سے لپٹ کر بولا۔ "آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ نے باپ بن کر مجھے تعلیم دی ہے۔ مجھے خود اعتمادی اور حوصلہ دیا ہے۔ حالات کو سمجھنا اور ان حالات سے نمٹنا سکھایا ہے۔ آپ پہلے یہ دیکھیں کہ وہ سچ مچ لندن جا کر میری اور زلیخا کی بات پکی کرتے ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے وہ زلیخا سے آپ کے نام خط لکھوا کر لائیں کہ وہ آپ کو ہمارے خاندان کی اعلیٰ اور محترم خاتون تسلیم کرتی ہے اور آپ کی بہو بننے کے لئے راضی ہے۔"

بانو بھی یہی چاہتی تھی کہ بیٹے کی خوشیاں پوری کرنے اور اس کی پسند کی شریکِ حیات لانے کے لئے پہلے حبیب الرحمان سے صاف صاف دو ٹوک باتیں ہو جائیں۔ باپ کے علاوہ بیٹی کی طرف سے بھی راضی نامہ ہو جائے اور جب تک ایسا نہیں ہو گا وہ ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے پھول باڑی نہیں جائے گی۔

جب حبیب الرحمان نے بانو کی زبان سے یہ فیصلہ کن باتیں سنیں تو اوپر سے بالکل شانت رہا بلکہ مسکرا کر یقین دلاتا رہا کہ وہ اپنی بیٹی سے ان ماں بیٹے کے حق میں راضی نامہ لکھوا کر لے آئے گا۔ حبیب الرحمان کی جگہ کوئی دوسرا بد دماغ شوہر ہوتا تو اپنی مردانگی دکھانے کے لئے گھریلو جھگڑے پیدا کرتا بلکہ بانو کو بلیک میل کرتا کہ وہ تقریباً بیس برسوں تک ایک اعلیٰ خاندان کی مالکہ کہلانے والی کم ذات چوکیدار کی بیٹی ہے۔ ایسی حقیقت عام ہونے سے اس کا بیٹا اونچی سوسائٹی میں اپنی ہتک محسوس کرتا۔ ادھر حبیب الرحمان دشمنی کرتا تو ماں بیٹے کی دولت اور جائداد سے محروم ہو جاتا۔ اس لئے اس نے بڑے تحمل سے کام لے کر بانو کو یقین دلایا کہ وہ جلد سے جلد اپنی بیٹی سے راضی نامہ لکھوا کر لے آئے گا بلکہ ہو سکا تو لندن سے ٹیلی فون کے ذریعے زلیخا کا نکاح شہید مرزا سے پڑھوا دے گا۔

یوں بھی وہ لندن جا کر وہاں کچھ عرصہ رہ کر زبان کے مسئلے پر ہونے والے سیاسی ہنگاموں اور ایسی سیاست سے دور رہنا چاہتا تھا۔ وہ لندن میں رہ کر اپنی بھاشا سے محبت کرنے والا بنگالی کہلانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے تحریک چلانے والے بنگالیوں کو چندے کے طور پر پندرہ ہزار روپے دیئے تھے۔ ان دنوں پندرہ ہزار روپے بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ بھی بنگالی کو قومی زبان منوانے کے لئے ہزاروں روپے دیتا رہے گا۔ اتنی فیاضی کے باعث پھول باڑی سے ڈھاکا تک جوشیلے نوجوان حبیب الرحمان زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے اور یوں اس کے نہ چاہنے کے باوجود

اسے اپنے سیاسی لیڈروں میں سے ایک لیڈر تسلیم کرتے رہتے تھے۔

اس کا شہید مرزا کو راستے سے ہٹانے اور سیاسی دلدل سے نکلنے کے لئے لندن جانا ضروری تھا۔ اس نے سیاسی ٹولیوں سے کہا تھا کہ لندن میں بیٹی بیمار ہے وہ بذریعہ ہوائی جہاز دو چار روز کے لئے جائے گا۔ پھر فوراً ہی واپس آجائے گا اور ایسے ہی وقت شہید مرزا کو ہمیشہ کے لئے ٹھکانے لگا دینے سے اس پر شبہ نہیں ہو گا۔

پٹ سن کی سپلائی میں اندرون ملک کوئی گڑبڑ ہوتی ' یا سپلائی میں اضافہ کرنا ہوتا تو شہید مرزا کو کبھی نارائن گنج اور کبھی برسیال جانا پڑتا تھا۔ یہ تمام شہر دریائے سیتالکھا کے کنارے تھے۔ پٹ سن کی گانٹھیں بڑی بڑی کشتیوں میں لاد کر لے جائی جاتی تھیں۔

حبیب الرحمان نے دفتر میں شہید مرزا کو ایک تحریری آرڈر دکھاتے ہوئے کہا "سیتالکھا کے اس پار بوریاں بنانے والی جو فیکٹری ہے وہاں پٹ سن کا بہت بڑا آرڈر ہے۔ یہ نئی پارٹی ہے۔ تمہیں مال کے ساتھ جانا چاہئے۔ صبح جاؤ گے تو آدھی رات سے پہلے واپس آجاؤ گے۔"

ادھر کے علاقوں میں نارائن گنج کے پٹ سن گوداموں سے مال جایا کرتا تھا۔ شہید مرزا کو پہلی بار اپنے تیج گاؤں کے گوداموں سے پٹ سن کی گانٹھیں سپلائی کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ وہاں اس کاروبار میں زیادہ تر ہندو مہاجن چھائے ہوئے تھے۔ مرزا ان کے مقابلے میں عمدہ کوالٹی کا پٹ سن سپلائی کرنے اور وہاں کی فیکٹریوں میں جگہ بنانے کا چانس کھونا نہیں چاہتا تھا۔

وہ رات ہی کو نارائن گنج پہنچ گیا۔ وہاں ایک بڑی کشتی پر پٹ سن کی بڑی بڑی گانٹھیں لوڈ کروائیں۔ پھر صبح چھ بجے وہاں سے روانہ ہوا۔ کشتی میں دو ہٹے کٹے ملاح لانبے لانبے بانس لئے دریا کی گہرائی کے مطابق کشتی کو آگے بڑھاتے جا رہے تھے۔ جب وہ نارائن گنج سے دور نکل آیا اور کشتی گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان پانی سے گزرنے لگی تو دونوں ملاح لانبے بانسوں کے سروں کو کشتی کے ایک سرے سے باندھنے لگے۔ شہید مرزا نے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟ کشتی کو جھاڑیوں کے درمیان سے نکالنے کے لیے بانس ضروری ہیں اور تم لوگ انہیں باندھ رہے ہو؟"

وہ دونوں ایک طرف پلٹ گئے۔ اب ان میں سے ایک کے ہاتھ میں درانتی تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں داؤ (چوڑے پھل کا چھرا) تھا۔ دوسرے نے کہا۔ "پہلے تم مرو گے

پھر یہ کشتی تمہاری لاش کے ساتھ یہاں ڈبو دی جائے گی۔ ہم نے اپنے بچ نکلنے کا بندوبست کر رکھا ہے۔"

درانتی والے نے کہا۔ "ہم یہاں سے تیر کر جائیں گے' آگے جھاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹی سی کشتی پہلے سے موجود ہے۔"

وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بولا۔ "تم لوگ مجھے قتل کرو گے اور کشتی کو مال سمیت ڈبو دو گے۔ اس سے تمہیں کیا ملے گا؟ کیا مجھے قتل کرنے کے لئے کسی نے تمہیں بڑا لالچ دیا ہے۔"

"صرف لالچ نہیں دیا ہے۔ اس نے دو ہزار ٹاکا نقد دیئے ہیں۔ کام ہو جانے کے بعد اور تین ہزار دے گا۔ ہم لوگوں کو پورے پانچ ہزار ملیں گے۔ پانچ ہزار.........."

"میں سمجھ گیا۔ تمہاری جیبوں میں جو دو ہزار ہیں' وہ حبیب الرحمان نے دیئے ہیں۔ لیکن وہ باقی تین ہزار نہیں دے گا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہو گا کہ ہم سوتیلے باپ بیٹے ہیں۔ اس نے میرے خلاف وہی چال چلی ہے جو میں چل کر آیا ہوں۔ میرے دو آدمی اب تک اسے قتل کر چکے ہوں گے۔ جب تم دونوں یہاں سے جاؤ گے تو تمہیں وہ زندہ نہیں ملے گا۔ اس کی لاش تمہیں تین ہزار ٹاکا نہیں دے گی۔"

وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے' یہ سمجھ سکتے تھے کہ سوتیلے باپ بیٹے ایک دوسرے کے خلاف ایسا کر سکتے ہیں۔ درانتی والے نے کہا۔ "کیا تم ہمیں بوکا (احمق) سمجھتے ہو؟ اپنی جان بچانے کے لئے ایسا کہہ رہے ہو۔"

"میں عقل کی بات سمجھا رہا ہوں۔ مجھے قتل کرو گے تو صرف وہی دو ہزار تمہارے ہوں گے اور زندہ چھوڑ دو گے تو چار ہزار ملیں گے۔"

اس نے اپنی ایک جیب سے نوٹوں کی موٹی سی گڈی نکالی۔ وہ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ وہاں گھر گھر میں ایسی غربت تھی کہ لاکھوں افراد کے ہاتھوں میں دن رات کی محنت مشقت کے بعد ایک یا دو روپے کا نوٹ آتا تھا۔ چاول خریدنا یا دو آنے کی ایک تندور کی روٹی خریدنا اس لئے بھی مشکل ہوتا تھا کہ کنبہ بڑا ہوتا تھا۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہوتا ہے جہاں چار یا چھ یا پھر دس بارہ بچے نہ ہوتے ہوں۔ وہ بچے بھی محنت مزدوری کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ بیک وقت سو روپے اپنے گھر میں یا اپنی جیب میں کما کر نہیں رکھ سکتے تھے۔ ان کا یہ المیہ مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد بھی جاری

ہے۔

یہ اس وقت کے مشرقی پاکستان کی اقتصادی بدحالی تھی۔ ایسے میں وہ دونوں بڑے نوٹوں کی موٹی سے گڈی دیکھ رہے تھے۔ شہید مرزا نے کہا۔ "جب مجھے مرنا ہی ہو گا تو میں اتنی بڑی رقم سمیت پانی میں چھلانگ لگا دوں گا۔ پھر میری زندگی ہو گی تو میں بچ نکلوں گا۔ مگر یہ تمام نوٹ پانی کی گہرائی میں بھیگ کر اور پھٹ کر کسی کے کام کے نہیں رہیں گے۔"

وہ دونوں دل ہی دل میں تسلیم کر رہے تھے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ ان کے سامنے جو چار ہزار روپے نظر آ رہے تھے وہ اتنی بڑی دولت ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس نے کہا "تمہارے دو ہزار میں یہ چار ہزار مل جائیں تو چھ ہزار ہو جائیں گے۔ بولو چھ ہزار چاہتے ہو یا میری موت؟ یہاں مجھے قتل کر کے جاؤ گے تو تم سے میری زندگی کا حساب پوچھنے والا اور باقی رقم ادا کرنے والا پہلے ہی قتل ہو چکا ہو گا۔ وہ ایڈوانس کی رقم تو تمہاری ہو ہی چکی ہے اب اس چار ہزار کے بارے میں فیصلہ کرو۔"

ایک نے پوچھا۔ "ہم کیسے یقین کریں کہ آپ یہ چار ہزار روپے ہمیں دے دیں گے؟"

"یہ جو تمہارے ہاتھوں میں درانتی اور داؤ ہیں یہ ہتھیار انسان کو مارتے ہیں۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ تم یہ دونوں ہتھیار پانی میں پھینک دو گے تو ہم میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں رہے گا۔ ہم میں سے کوئی کسی کی جان نہیں لے سکے گا۔"

وہ پھر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ بولا۔ "تم لوگ اپنی مالکہ بانو بی بی کو برسوں سے جانتے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ میں اپنی امی بانو بی بی کی قسم کھا کر جھوٹ نہیں بولتا۔ میں تمہاری اسی مالکہ کی' اپنی امی کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ ہتھیار پھینک دو۔ میں یہ چار ہزار تمہیں دے دوں گا۔"

ایک نے داؤ دریا میں پھینکتے ہوئے کہا۔ "آپ نے ماں کی قسم کھائی ہے۔ یہ لیجئے۔ میں نے ہتھیار کو پھینک دیا۔"

دوسرے نے درانتی کو پانی میں پھینک کر کہا۔ "سپاہی ہتھیار پھینک دیں تو اپنا ملک ہار جاتا ہے اور غریب ہتھیار ڈال دیں تو بغاوت اور عداوت ہار کر تابعدار بن جاتے ہیں' جو مالک چاہتا ہے وہی کرتے ہیں۔ اب آپ جو دیں گے وہی لیں گے نہیں دیں گے تو ہاتھ جوڑ کر مانگنے کی عادت پر قائم رہیں گے۔"

شہید مرزا نے آگے بڑھ کر نوٹوں کی وہ گڈی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے لئے دولت ہے۔ میرے لئے ماں کی قسم ہے۔ اسے لو اور موج کرو۔"

ایک نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رقم لی۔ پھر دونوں اس کے قدموں پر جھک گئے۔ وہ بولا۔ "اٹھو' وہ حساب ختم ہو چکا ہے۔ اب نیا حساب کرو۔ اگر اس چھ ہزار میں اور چار ہزار مل جائیں تو کتنے ہو جائیں گے۔"

ایک نے اس کے قدموں سے سر اٹھا کر کہا۔ "دس ہزار۔"

شہید مرزا نے کہا۔ "ماں کی قسم سچی تھی' وہ میں نے پوری کر دی۔ مگر میری وہ پہلی بات غلط تھی' میں سوتیلے باپ کی دشمنی میں اس حد تک نہیں گیا تھا۔ اس نے مجھے حد سے بڑھنے کا راستہ سمجھا دیا ہے۔ اگر تم اسے ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دو تو مزید چار ہزار ملیں گے۔"

وہ دونوں اس کے قدموں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر اپنے ہاتھ جوڑ کر اسے ایسے دیکھنے لگے جیسے بات سمجھ گئے ہوں لیکن وضاحت چاہتے ہوں۔

اس نے وضاحت کی کہ کتنی احتیاط اور منصوبہ بندی کے ساتھ حبیب الرحمان کو ٹھکانے لگانا ہے لیکن اس نے یہ وضاحت نہیں کی کہ وہ اپنا قتل کرانے والے کی نیت کو سمجھتا تھا۔ نیت محض یہ نہیں تھی کہ وہ اس کی اور اس کی ماں کی دولت اور جائداد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایسا چاہتا تو سیدھی طرح شرافت سے اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دیتا۔ اس طرح دو دولت مند خاندان ایک ہو جاتے۔ ایک طرف بانو اور حبیب الرحمان خوش رہتے دوسری طرف زلیخا اور شہید مرزا خوش حالی اور ترقیوں کی راہوں پر گامزن رہتے۔

لیکن نہیں' نیت کافرانہ تھی۔ دینِ اسلام میں کوئی ادنیٰ اور اعلیٰ نہیں ہوتا اور حبیب الرحمان اس کی ماں ارجمند بانو کو ایک ادنیٰ چوکیدار کی بیٹی کہہ کر ذہنی اذیت پہنچا رہا تھا۔ شہید مرزا کو بھی ایک ادنیٰ ماں کا بیٹا سمجھ کر اسے ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا رہا تھا تاکہ لندن سے تعلیم حاصل کر کے آنے والی بیٹی اور ایک چوکیدار کے نواسے کی شادی کی نوبت نہ آئے۔

ارجمند بانو پہلے شوہر کی وفات کے بعد تمام کاروباری ذمے داریوں کا بوجھ سنبھالنے کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایسے طلبا و طالبات کے تعلیمی اخراجات برداشت کرتی تھی

جو غریب مگر ذہین ہوتے تھے۔ ایسا ہی ایک نائٹ چوکیدار کا بیٹا قاضی امجد تھا جو ہر سال امتحانات میں اول آتا تھا۔ ارجمند بانو نے ایم تک اس کے تعلیمی اخراجات پورے کئے تھے۔ وہ بانو اور شہید مرزا کا احسان مند اور تابعدار تھا۔

شہید مرزا نے قاضی امجد کو اپنی ڈھاکا والی کوٹھی میں بلا کر اسے یہ روداد سنائی کہ حبیب الرحمان نے کس طرح اس کی ماں سے فراڈ کیا ہے اور اسے محض چوکیدار کا نواسہ مان کر قتل کرانا چاہتا تھا۔

قاضی امجد ایک تو بانو بی بی کا احسان مند تھا۔ دوسرے یہ کہ خود ایک چوکیدار کا بیٹا تھا۔ اس نے کہا۔ "افسوس! انسان دوسروں کو اپنے برابر کا انسان کیوں نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی کسی اعتبار سے کمتر ہے اور وہ اپنی محنت اور لگن سے بلند مقام حاصل کرتا ہے تو پھر کسی کو چوکیدار کا بیٹا یا نواسہ حقارت سے نہیں کہنا چاہئے۔"

شہید مرزا نے کہا۔ "یہی کہتا ہوں کہ اگر ہم نیچے سے اوپر نہیں جا سکتے تو اوپر والے کو نیچے لا سکتے ہیں' کیا تم میرے راز دار بنو گے؟"

قاضی امجد نے کہا۔ "میں اور میرا پورا خاندان آپ کا نمک خوار ہے۔ میرے گھر کے لوگ سیلاب میں بہہ گئے۔ تقدیر نے مجھے آپ کی خدمت کرنے کے لئے زندہ رکھا ہے۔ میں آپ کا راز سینے میں چھپا کر رکھوں گا۔"

"راز یہ ہے کہ وہ مجھے قتل کرانا چاہتا تھا۔ کل پلٹن میدان میں حکومت کے خلاف جلسہ ہے۔ وہاں لاٹھی چارج اور فائرنگ ہو سکتی ہے۔ اسی ہنگامے میں میرے آدمی اسے قتل کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہئے۔ اگر آپ مجھے حکم دیتے تو میں آپ کے جانی دشمن کو قتل کر دیتا۔ آپ کے لئے پھانسی پر چڑھ جاتا۔"

"میں اتنی بڑی قربانی تم سے نہیں چاہتا۔ جو چاہتا ہوں وہ کرو۔ اپنا نام تبدیل کرو۔ عارضی طور پر خود کو شہید مرزا کہو۔"

وہ چونک کر بولا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ مالک ہیں اور میں آپ کا.........."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "تم میرے دوست ہو اور راز دار ہو۔ تمہارے اندر جو کمتر ہونے کا احساس ہے اسے ختم کرو ورنہ میرے کسی کام آنے سے انکار کر دو۔"

"میں انکار کرنے سے پہلے مرجاؤں گا۔ آپ کہتے ہیں تو میں خود کو شہید مرزا کہوں گا۔"

"تم پلٹن میدان سے اس کی لاش ایک گاڑی میں ڈال کر پھول باڑی جاؤ گے۔ وہاں سب کو معلوم ہونا چاہئے کہ حبیب الرحمان کی لاش شہید مرزا لے کر آیا تھا۔ پھر تیج گاؤں کے چوراہے پر میری جو زمین ہے' وہاں حبیب الرحمان کی یادگار قائم کرو گے۔"

وہ حیران ہو کر بولا۔ "آپ دشمن کو شہید کا بلند مقام دیں گے؟"

"ہاں وہ باپ بیٹی ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ تم اس یادگار کی جگہ شہید مینار تعمیر کراؤ گے۔ اس کے باپ سے عقیدت ظاہر کرو گے تو وہ تم سے متاثر ہوتی رہے گی۔"

"لیکن میں تو یہ جانتا ہوں کہ آپ زلیخا بی بی کو بہت چاہتے ہیں۔ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں میں اسے چاہتا ہوں مگر ایک چوکیدار کا نواسہ بن کر۔ میری چاہت جو زلیخا کے لئے ہے اس چاہت میں میری ماں اور میرے نانا کا بھرپور احترام ہونا چاہئے۔ اور تم بھی اسے چاہو گے ایک اعلیٰ خاندان کے شہود مرزا کے دولت مند بیٹے شہید مرزا کی حیثیت سے اسے متاثر کرو گے۔ میں بھی اس کے دل میں جگہ بنانا چاہوں گا اور خود کو معمولی گھرانے کا فرد ظاہر کروں گا۔"

قاضی امجد نے کہا۔ "وہ مجھ سے دولت مند سمجھ کر متاثر ہوگی۔ آپ غریب بن کر رہیں گے تو آپ کو کبھی پلٹ کر نہیں دیکھے گی۔"

"ہاں غریب کو کوئی نہیں پوچھتا۔ میں خود کو ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ظاہر کروں گا لیکن کسی موقعے پر یہ ضرور کہوں گا کہ میرے نانا صاحب کبھی ایک چوکیدار تھے لیکن میں عزت اور شرافت سے کماتا اور کھاتا ہوں اور بڑی محنت اور لگن سے پستی سے بلندی کی طرف آرہا ہوں۔"

ہونا یہی چاہئے' جو بڑی لگن سے محنت کرتے ہیں' اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کے ذریعے پستی سے بلندی کی طرف آتے ہیں' ان کی قدر ہونی چاہئے۔ پدرم سلطان بود کہنے والے اور اپنے اعلیٰ خاندان کا راگ الاپنے والے اور فریب دینے والے صرف اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے ایسی حرکتیں کرتے ہیں جیسی حبیب الرحمان کرتا آرہا تھا۔

قاضی امجد نے پوچھا۔ "آپ اپنا نام مجھے دے رہے ہیں پھر آپ کا نام کیا ہوگا؟"

"میرا نام بھی شہید مرزا رہے گا۔ کیا ایک نام کے دو آدمی نہیں ہوتے؟ سرکاری' کاروباری فائلوں اور چیک وغیرہ پر میرے دستخط ہوا کریں گے۔ تم صرف ایک سائن بورڈ کی طرح میری جگہ رہو گے۔"

"لیکن تیج گاؤں کے لوگ ہم دونوں کو پہچانتے ہیں۔"

"تم صرف ایک دن میری تیج گاؤں والی کوٹھی میں زلیخا سے ملاقات کرو گے اور اسے بتاؤ گے کہ تم نے وہ کوٹھی بیچ دی ہے اور اب ڈھاکا والی کوٹھی میں رہتے ہو۔ پھر ڈھاکا کی جس کوٹھی میں اس سے تمہاری ملاقاتیں ہوا کریں گی وہاں تمہیں کوئی نہیں جانتا ہے۔ لہٰذا بہ آسانی شہید مرزا کا نام استعمال کرتے رہو گے۔"

"اگر وہ مجھ سے شادی کے لئے راضی ہو جائے گی تو کیا ہوگا؟"

"وہ ایک لاٹری ہے جس کے نام نکلے گی اس کی ہو جائے گی۔ میں اس زلیخا کو اپناؤں گا جو مجھے چاہے گی۔ جو زلیخا تمہیں پسند کرے گی تم اس سے شادی کرو گے۔"

"کیا شادی ضروری ہے؟"

"ہاں' میں کروں یا تم کرو' ہم دونوں میں سے ضرور کسی کو شادی کر کے اس کی خاندانی برتری کو مارنا ہے۔ اسے چوکیداروں کے خاندان میں لانا ہے۔"

قاضی امجد تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "اگر یہ معاملہ شادی تک جانے والا ہے تو پھر ذرا سنجیدگی سے سوچا جائے۔ اکثر لوگوں کے دو نام ہوتے ہیں۔ ایک پیدائشی نام ہوتا ہے پھر دودھیال کے یا ننھیال کی طرف سے دوسرے نام سے پکارا جاتا ہے اگر زلیخا میری ذات میں دلچسپی لے گی تو میں اسے اپنے دو نام بتاؤں گا اور ان ناموں کے سلسلے میں معقول دلائل دوں گا۔"

شہید مرزا نے تائید کی۔ "ہاں' اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ کہیں کوئی دوست یا شناسا تمہیں قاضی امجد کہے گا تو وہ شبہ نہیں کرے گی۔ اگر شادی تک نوبت پہنچے گی تو نکاح اس طرح درست ہوگا کہ نکاح نامے پر قاضی امجد عرف شہید مرزا لکھوایا جاسکے گا۔"

وہ دونوں بڑی دیر تک منصوبے بناتے رہے اور ان منصوبوں کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ پھر انہوں ان پر عمل کرنا بھی شروع کر دیا۔ دوسرے دن پلٹن میدان کے جلسے میں پتھراؤ اور لاٹھی چارج ہوا۔ ایسے وقت میں ان دونوں قاتلوں نے حبیب الرحمان کو دبوچ لیا۔ پھر ایک نے کہا۔ "ہم نے تم سے تین ہزار بھی وصول کئے لیکن

اپنے مالک کو زندہ چھوڑ دیا کیونکہ تم نے پانچ دیئے انہوں نے آٹھ ہزار دیئے۔"

وہ اور کچھ نہ بول سکے۔ پولیس والے آنسو گیس چھوڑ رہے تھے۔ انہوں نے داؤ اور درانتی سے کئی وار کئے پھر اس کی لاش گرا کر چلے گئے۔

شہید مرزا نے اپنی ماں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ جس نے اس سے دوسری شادی کی تھی اس نے اسی کے بیٹے پر قاتلانہ حملہ کرانا چاہا تھا لیکن وہ بچ گیا۔ اگر وہ ماں سے یہ بات کہتا تو وہ اس شرم سے مرجاتی کہ اس نے دوسری شادی کی غلطی کر کے بیٹے کے لئے ایک قاتل پیدا کر دیا ہے۔

اور ماں کو حقیقت بتانے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں رہی کہ اس نے حبیب الرحمان کا قصہ ہی ختم کر دیا تھا۔ ماں کو یہ سمجھانا ضروری نہیں تھا کیونکہ وہ ایک سیاسی جلسے میں ہونے والے ہنگامے میں مارا گیا تھا۔

وہ ہنگامہ خیز جلسہ رات کی تاریکی پھیلنے سے پہلے ختم ہو گیا۔ منصوبے کے مطابق قاضی امجد اس کی لاش ایک گاڑی میں ڈال کر چند سیاسی کارکنوں کے ساتھ پھول باڑی چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنا نام شہید مرزا بتایا لیکن یہ نہیں بتایا کہ مقتول حبیب الرحمان اس کا سوتیلا باپ ہے۔ بعد میں اگر بانو کو کچھ کہنا ہوتا تو اس کے مطابق بات بنا دی جاتی اور بانو نے صرف ایک دن پھول باڑی میں رہ کر یہ کہہ دیا تھا کہ جب تک زلیخا اور شہید مرزا کی بات پکی نہیں ہو گی وہ دوبارہ پھول باڑی نہیں آئے گی۔

انسان اپنی دنیا میں بہت کچھ کرتا ہے اس سے زیادہ اللہ کرتا ہے۔ اسی رات بانو قیامت تک نہ اٹھنے کے لئے سو گئی۔ اس کی موت طبعی تھی۔ بعض افراد کو ان کے صدمات اندر سے مارتے ہیں۔ بانو کو شرمندگی نے قتل کیا تھا۔ اکثر شرم والیوں کو شرم ایسے مارتی ہے کہ اوپر سے قتل کا کوئی نشان نہیں چھوڑتی۔ ایسی موت بھی طبعی کہلاتی ہے۔

☆=====☆======☆

شہید مرزا ایزی چیئر پر بیٹھا سامنے میز پر رکھی ہوئی زلیخا کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تصویر تقریباً دس برس پہلے کی تھی۔ جب وہ تعلیم حاصل کرنے لندن جا رہی تھی اس وقت وہ دھان پان سی تھی' جوان نہیں تھی جوانی کا پیش لفظ تھی۔ اب تو بھرپور دوشیزہ ہو گئی تھی۔ اسے دیکھنے سے یوں لگتا تھا جیسے مقناطیس کو تراش کر بنائی گئی ہو۔ اس لئے بدن کے

ہر زاویے میں کشش بھری ہوئی تھی۔ دل اسی پر آتا ہے جس میں حسن و جمال ہو اور بھرپور کشش ہو لیکن شہید مرزا کا دل دس برس پہلے ایسے وقت اس پر آیا تھا جب اس میں ایسا حسن و جمال اور کشش نہیں تھی۔ وہ تو اس لئے اسے چاہتا تھا کہ اس کی ماں نے اسے پسند کیا تھا اور اس سے پوچھا تھا۔ "بیٹے! زلیخا تمہیں کیسی لگتی ہے؟"

پھر ماں نے اس کی خوشی کے لئے حبیب الرحمان سے شادی کی تھی اور اسے قائل کرتی رہی تھی کہ وہ زلیخا سے اس کے بیٹے کا رشتہ پکا کرے۔ جب تک ایسا نہیں کرے گا وہ پھول باڑی میں اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے نہیں رہے گی۔ اسی لئے وہ ایک دن کے بعد ہی پھول باڑی سے واپس آگئی تھی۔

وہ اپنی ماں کی بھرپور ممتا کو خوب سمجھتا تھا لیکن حبیب الرحمان نے اسے ایک چوکیدار کی بیٹی کہہ کر بلندی سے پستی کی طرف پھینک دیا تھا۔ اب ماں نہیں رہی تھی مگر اس کی حسرت رہ گئی تھی کہ زلیخا اسے خاندانی اعتبار سے کمتر نہ سمجھے اور اس کے بیٹے سے شادی کرے۔

ہو سکتا تھا کہ زلیخا اسے پسند کر لیتی اور شادی کر کے اس کی ماں کی خواہش پوری کر دیتی۔ اس لئے شہید مرزا نے حبیب الرحمان سے قتل کا بدلہ قتل سے لینے کے باوجود اس کی موت کو حرام موت بننے نہیں دیا۔ سیاسی حالات اور سیاسی ورکروں نے اسے شہید حبیب الرحمان کہنا شروع کیا تو مرزا نے سوچا' یہ اس زلیخا کے باپ کے لئے بہت بڑا اعزاز ہے جو اس کی دلہن بن کر آئے گی اور دلہن بن کر آنے والی اپنے باپ کو اس قدر چاہتی تھی کہ اسی کے ایسے زریں اصولوں پر عمل کرتی تھی جو اسے دوسروں سے برتر بناتے تھے۔ شہید مرزا اس کے احساسِ برتری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے جاننے کے لئے ہی وہ ایک طرف معمولی خاندان کا شہید مرزا بن گیا۔ دوسری طرف اس نے قاضی امجد کو دولت مند شہید مرزا بنا دیا۔

اس دنیا کے اسٹیج پر آدمی کو کبھی تماشا بننا پڑتا ہے اور کبھی تماشائی۔ شہید مرزا نے جو کھیل شروع کیا تھا اس کی ابتدا دیکھ لی تھی۔ اس نے گلاب کے پھول پر تھوک دیا تھا اور اس کی کوٹھی میں گئی تھی جہاں گلاب کو قتل کیا جاتا ہے اور کانٹوں کی پرورش کی جاتی ہے۔

اس کھیل کا دوسرا سین دوسری جمعرات کو دیکھنے میں آیا۔ شہید مرزا نے فون پر زلیخا

سے کہا تھا کہ آئندہ جمعرات کو وہ کوٹھی میں آئے گی تو اس سے ملاقات ہو گی۔ اور کوٹھی کی طرف جانے کے لئے اسی راستے سے گزرنا پڑتا تھا جہاں شہید مرزا اس کے انتظار میں کھڑا رہتا تھا۔ وہ پچھلی جمعرات کو نظر نہیں آیا تھا اس کی جگہ گلاب کا پودا لگا ہوا تھا اور زلیخا گلابوں کو حقارت سے دیکھ کر گزر گئی تھی۔

اسی جمعرات کو کوٹھی میں شہید مرزا سے ملاقات ہونے والی تھی اور اصلی شہید مرزا اس گلاب کے پودے کے پاس کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کار کو دور سے دیکھتے ہی اسے روکنے کا اشارہ کیا۔ زلیخا نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ وہ رکنا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ کار کے سامنے ایسے آگیا جیسے کار کے حادثے میں مرنے کا ارادہ لے کر آیا ہو۔ ڈرائیور نے فوراً ہی بریک لگا کر گاڑی روک دی۔ وہ کار کے آگے سے ہٹ کر پھر تیزی سے چلتا ہوا پچھلی سیٹ کے پاس آیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ غصے سے بولی۔ "کیا تم پاگل کے بچے ہو؟ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟ کیا تمہیں پولیس کے حوالے کروں؟"

وہ بولا۔ "آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں خود ہی حوالات میں چلا جاؤں گا۔ آپ سے صرف دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ میرا نام شہید مرزا ہے۔"

"کیا؟" وہ ایک دم سے چونک گئی۔ پہلے تو یوں لگا جیسے کوٹھی میں جس سے ملنے جا رہی ہے وہ خود ہی اس کے استقبال کے لئے آگیا ہے۔ وہ خوشی سے دروازہ کھول کر باہر آنا چاہتی تھی پھر رک گئی۔ اسے یاد آگیا کہ وہ اس دیوانے کو ہر ساتویں دن سڑک کے کنارے دیکھتی رہی تھی جبکہ ایک مطلوبہ شہید مرزا کراچی گیا ہوا تھا۔ وہ خود فون پر اس سے گفتگو کر چکی تھی۔

وہ جھنجلا کر بولی۔ "تمہارا نام ایکس وائی زیڈ کچھ بھی ہے۔ میں کیا کروں؟"

"میری حوصلہ افزائی کرو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"یو شٹ اپ۔ پہلے اپنی اوقات دیکھو پھر یہ خواب دیکھو۔"

پھر اس نے ڈرائیو سے گاڑی چلانے کے لئے کہا۔ اس نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے چابی گھمائی۔ کار کا انجن بیدار ہوا۔ پھر سو گیا۔ شہید مرزا نے کہا۔ "میری اوقات کی بات نہ کرو۔ میں ایک خاندانی آدمی ہوں۔ سڑک کے کنارے بھکاری بن کر نہیں' تمہارا دیوانہ بن کر کھڑا رہتا ہوں۔"

"کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ سڑک کے کنارے بھیک مانگی جاتی ہے' محبت نہیں۔"

"اگر سڑک پر اعتراض ہے تو میں حویلی کے دروازے پر تمہیں مانگنے آؤں گا۔"

ڈرائیور چابی گھما کر بار بار کوششیں کر رہا تھا۔ کار کا انجن جاگتے جاگتے سو جاتا تھا۔ وہ غصے سے بولی۔ "ذلیل! کتے! یہ گاڑی کیوں اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے؟"

شہید مرزا نے کہا۔ "یہ غریب ڈرائیور انسان ہے' کتا نہیں ہے۔ اگر تم اسے کتا سمجھتی ہو تو تمہیں کسی انسان کو ڈرائیور رکھنا چاہئے تھا۔ بھلا کہیں کتے کار ڈرائیو کرتے ہیں؟"

وہ اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسی وقت کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ وہ پیچھے رہ گیا۔ دل میں کہنے لگا۔ "بہت مغرور ہے۔ اچھا ہوا کہ امی اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ اگر ہوتیں تو میری ایسی توہین پر صدمے سے ٹوٹ جاتیں اوز اگر وہ میرے سامنے امی کی شان میں کوئی گستاخی کرتی اور انہیں اپنے سے کمتر سمجھتی تو میں اس مغرور حسینہ کو اس کے باپ کے پاس پہنچا دیتا۔"

کار اس کی نظروں سے دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا' وہ خوش ہے کہ اس کے باپ کو ایک شہید کا درجہ مل رہا تھا۔ یعنی اس کے خیال میں اس کے باپ نے بنگلہ بھاشا کو قومی زبان بنانے کی جدوجہد کرتے ہوئے اپنی جان دے کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ شہید باپ کو ملک سے اور بنگالی قوم سے کتنی محبت ہے۔ اس کی بیٹی اس بنگالی قوم کے ایک ڈرائیور کو حقارت سے کتا کہہ رہی تھی اور اسی بنگال کی دھرتی پر کھلنے والے گلاب پر تھوکا بھی تھا۔ سیاستدانوں اور مغرور خاندانی لوگوں میں جو دوغلا پن ہوتا ہے وہی زلیخا کے مزاج میں تھا۔

چوکیدار نے اس کی کار کو دیکھتے ہی احاطے کے بڑے سے گیٹ کو کھول دیا۔ اس کی کار گیٹ سے گزر کر احاطے میں داخل ہوئی۔ پھر ایک جگہ آکر رک گئی۔ وہاں بڑی ویرانی اور سناٹا تھا۔ ڈرائیور نے کار سے اتر کر فوراً پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے کوٹھی کے بیرونی دروازے کو دیکھا جہاں سے گزر کر اندر جانا تھا۔ وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں ایک نوجوان کھڑا ہوا تھا اور اب اس کی طرف آرہا تھا۔ اس کے جسم پر قیمتی سوٹ دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ دھڑکنیں کہہ رہی تھیں' یہی ہے وہ جس سے ملنے اور جسے ایک نظر دیکھنے کے لئے وہ پچھلی جمعرات سے بڑی بے چین تھی۔

وہ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں ہوں شہید مرزا اور تم یقیناً زلیخا

ہو؟"

"جی ہاں!" اس نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ "آپ سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

بھلا خوش کیوں نہ ہوتی۔ اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے اس مرد کو دیا تھا جس کا ہاتھ ایک مہنگے سوٹ کی آستین سے نکلا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ "ہر ہاتھ ملانے والا رسمی طور پر یہی کہتا ہے کہ آپ سے مل کر خوشی ہو رہی ہے لیکن تمہاری خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم مجھے دیکھ کر مایوس نہیں ہوئی ہو اور تمہاری خوشی رسمی نہیں ہے۔"

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے ساتھ چلتا ہوا کوٹھی کے اندر آیا۔ وہ اندر قدم رکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ کوٹھی بالکل خالی تھی۔ جس ڈرائنگ روم میں اس نے قدم رکھا تھا وہاں کوئی سامان نہیں تھا۔ صرف دو کرسیاں تھیں۔ اس نے کہا۔ "میں نے تمہیں فون پر نہیں بتایا تھا کہ میں نے یہ کوٹھی فروخت کر دی ہے یہاں کا تمام سامان دوسری جگہ منتقل کرا دیا ہے۔"

"آپ نے اسے کیوں بیچ دیا؟"

"مہنگے اور بڑے امیر کبیر لوگوں کے علاقے میں رہنے کے لئے۔ میں نے سوچا' تم لندن سے آئی ہو تمہیں اونچی سوسائٹی میں رہنا چاہئے۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ دو کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ بولی "یہ آپ نے اچھا کیا۔ انسان کو اپنے اعلیٰ ذوق اور معیار کے مطابق رہنا چاہئے۔"

وہ قاضی امجد تھا۔ شہید مرزا بن کر اسے متاثر کر رہا تھا اور اپنے اندر یہ تسلیم کر رہا تھا کہ وہ دل میں اتر رہی ہے۔ پہلے کبھی کسی امیر زادی نے سمندر پار سے آ کر اپنا قیمتی وقت اور اپنی محبوبانہ مسکراہٹ نہیں دی تھی۔ اس سے رومانی تاثر حاصل کرنے کے باوجود وہ اپنے حواس میں رہ کر سمجھ رہا تھا کہ سامنے بیٹھی حسینہ اس کے محسن اور مالک کی امانت ہے۔ قاضی امجد اور شہید مرزا کو یہ دیکھنا اور سمجھنا تھا کہ وہ تکبر اور برتری سے باز آ کر ان دونوں میں سے کسے ترجیح دے گی اور کس کے ساتھ شادی کے مرحلے تک پہنچے گی۔

اسے منصوبے کے مطابق یہ معلوم تھا کہ ابھی زلیخا کو راستے میں شہید مرزا نے روکا

ہو گا اور اپنی محبت کا اظہار کیا ہو گا۔ اس اظہارِ محبت کا نتیجہ کیا ہوا ہو گا۔ یہ قاضی کو بعد میں شہید مرزا سے معلوم ہونے والا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا گلبرگ میں میری نئی کوٹھی دیکھنا چاہو گی۔ آئندہ ہماری ملاقات وہیں ہوا کرے گی۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "ابھی آپ نے کہا تھا کہ مجھے اونچی سوسائٹی میں رہنا چاہئے۔ اس لئے مجھے ضرور اس کوٹھی کو دیکھنا چاہئے۔"

"ہم ابھی چلیں گے لیکن میں اپنے بارے میں کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔ ہمارے خاندان میں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو اس کے دو نام رکھے جاتے ہیں۔ ایک نام ددھیال کی طرف سے اور دوسرا ننھیال کی طرف سے۔"

اس نے تائید کی۔ "ہاں بڑے خاندانوں میں ایسا ہوتا ہے میرے نانا نے میرا نام زلیخا رکھا تھا لیکن میرے بابا مجھے ماڈرن بنانا چاہتے تھے۔ انہیں پرانے قسم کے نام پسند نہیں تھے۔ انہوں نے میرے نانا کے رکھے ہوئے نام پر اعتراض نہیں کیا لیکن مجھے جولی کہا کرتے تھے۔"

"میرے نانا نے میرا نام شہید مرزا رکھا تھا لیکن میرے والد کا نام قاضی احمد حسین تھا۔ انہوں نے میرا نام قاضی امجد حسین رکھا۔ میں نے قاضی امجد کے نام سے ہی تعلیم حاصل کی ہے لیکن کاروبار میں شہید مرزا کے نام سے کرتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "شاید آپ کو ننھیال کا نام پسند ہے اسی لئے شہید مرزا کہلاتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں اپنی سوسائٹی میں قاضی امجد کے نام سے پہچانا جاتا ہوں۔"

"میں سمجھ گئی' آپ شہید مرزا کے نام سے کاروبار کر کے کالا دھن بچاتے ہوں گے اور انکم ٹیکس والوں سے نجات حاصل کرتے ہوں گے کیونکہ اسکول اور کالج سے لے کر اپنی موجودہ سوسائٹی تک قاضی امجد کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔"

"تم بڑے باپ کی بیٹی ہو' کاروباری ہتھکنڈوں کو خوب سمجھتی ہو۔" پھر اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ "تم کسے پسند کرتی ہو قاضی کو یا شہید کو؟"

اس نے ذرا سوچا پھر کہا۔ "ابھی راستے میں ایک دیوانہ ملا تھا۔ کہہ رہا تھا' اس کا نام شہید مرزا ہے۔ مجھے تو دیوانگی سے وحشت ہوتی ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ قاضی امجد کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں' مجھے بھی یہی نام پسند ہے۔"

قاضی امجد کا دل مسرتوں سے بھر گیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ مالدار' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور

سمارٹ حسینہ اسے شہید مرزا پر ترجیح دے رہی تھی۔ وہ محبت کے معاملے میں شہید مرزا سے مقابلہ کرنے کو نمک حرامی سمجھتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ بھی پیار کا بھوکا انسان تھا۔ اس کے دل میں بھی کسی حسینہ سے چاہے جانے کی آرزو تھی۔ چونکہ مرزا نے کہا تھا کہ زلیخا ایک لاٹری ہے۔ وہ لاٹری جس کے نام نکلے گی وہی اس کا حق دار ہو گا یعنی مرزا نے پہلے ہی اجازت دے دی تھی کہ زلیخا اس کی طرف مائل ہو تو وہ اس سے صرف محبت ہی نہیں شادی بھی کر سکتا ہے۔

اپنے مالک اور محسن کی طرف سے ایسی فراخدلانہ اجازت ملنے پر وہ خود کو خوش بخت سمجھ رہا تھا۔ یہ خوش بختی یک طرفہ نہیں تھی۔ اس کے سامنے جو خوش بختی بیٹھی ہوئی تھی وہ بھی خود کو اس کے نام لکھنے کا انداز اختیار کئے ہوئے تھی۔

اور یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ شہید مرزا نے جس طرح اس کے باپ کو شہید مشہور کر کے اسے متاثر کیا تھا اس تاثر کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی محبت کی ابتدا بھی اور انتہا بھی قاضی کو ہی سمجھتی۔ اس نے پوچھا۔ "آپ کو میرے بابا سے اتنی عقیدت کیوں ہے؟"

"تم نے یہ سوال فون پر بھی کیا تھا لیکن مصلحتاً میں نے جواب نہیں دیا کیونکہ اس میں ایک راز ہے۔"

"کیسا راز؟"

"بات یہ ہے کہ میرے ابو مسلم لیگ کے بڑے سیاسی لیڈروں میں سے ایک تھے۔ مسلم لیگ کے لئے انہوں نے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے برعکس تمہارے بابا سیاست میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ کسی بھی سیاسی پارٹی سے میلوں دور رہتے تھے۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی۔ "ہاں' وہ مجھے بھی سمجھاتے تھے۔ جب بھی لندن آتے تھے یہی کہتے تھے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سب کچھ کرنا مگر سیاست میں کبھی نہ پڑنا۔"

"اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت سمجھ دار تھے لیکن یہ ہم جانتے تھے کہ سیاست سے دور رہنے کے باوجود میرے ابو سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی۔ وہ چھپ چھپ کر مسلم لیگ کے کام آیا کرتے تھے اور بڑی بڑی رقمیں چندے کے طور پر اس پارٹی کو دیتے تھے۔"

"کیا واقعی؟" وہ تعجب سے بولی۔ "بابا نے مجھے کبھی یہ نہیں بتایا۔"

اس نے بظاہر تعجب ظاہر کیا' وہ اپنے بابا کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ تمام سیاسی پارٹیوں

سے بنائے رکھتے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے صرف مسلم لیگ کو ہی نہیں' کانگریس کو بھی اسی طرح چندے وغیرہ دے کر خوش رکھتے تھے۔

قاضی نے بتایا۔ "بابا نے تمہیں اس لئے نہیں بتایا ہو گا کہ ان دنوں تم چھوٹی سی بچی تھی۔ بعد میں بھی انہوں نے اس لئے نہیں بتایا کہ وہ تمہیں سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ بہر حال پاکستان بن گیا۔ پھر یہاں لسانی مسئلہ پیدا ہو گیا۔ وہ بنگالی جو مسلم لیگ میں ہیں' وہ قائد اعظم کے فرمان کے مطابق اردو زبان کے حامی ہیں۔ باقی تمام بنگالی بنگلہ بھاشا کو قومی زبان بنانے کی تحریک چلا رہے ہیں۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "تم تو لندن میں تھیں۔ یہاں تمہارے بابا مشکلات میں تھے۔ وہ مسلم لیگی حکومت کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف بنگالی اکثریت کی حمایت پر بھی مجبور تھے کیونکہ انہیں' تمہیں اور ہم سب کو بنگال میں ہی رہنا تھا اور اب بھی رہ رہے ہیں۔"

"بابا نے آخری بار مجھے جو خط لکھا اس میں ایسی ہی پریشانیوں کا ذکر تھا۔ وہ سیاسی دلدل سے نکلنے کے لئے میرے پاس لندن آکر رہنا چاہتے تھے۔ میں نے ان کا انتظار کیا لیکن مجھے ان کے شہید ہونے کی خبر ملی۔ مجھے ان کی وفات کا جتنا صدمہ ہے وہ ایک الگ بات ہے لیکن یہ میرے لئے حیرانی کی بات ہے کہ وہ سیاست سے دور بھاگتے تھے پھر وہ شہید ہونے کے لئے جلسے میں کیوں چلے گئے؟"

"بنگلہ بھاشا کی تحریک اتنا زور پکڑ گئی تھی کہ وہ اپنے علاقے کے جوشیلے جوانوں اور سیاستدانوں سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ میں نے انہیں چپکے سے سمجھایا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ جلسے میں شریک ہونے نہیں جائیں گے تو وہ تمام لوگ انہیں حکومت کا چمچہ' سمجھ کر جان سے مار سکتے ہیں لہٰذا انہیں جلسے میں جانا چاہئے پھر پلٹن میدان پہنچ کر ہزاروں لاکھوں کے مجمع میں سے دھیرے دھیرے کھسکتے ہوئے منہ چھپا کر جلسہ سے چلے جانا چاہئے۔ لاکھوں افراد میں پتا نہیں چلے گا کہ وہ چھپ کر جا چکے ہیں۔"

پھر وہ افسوس کرنے کے لئے گہری سانس لے کر بولا۔ "مگر قسمت کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ ہنگاموں کی نذر ہو گئے۔ پتا نہیں وہ کس طرح جان سے گئے لیکن انہوں نے تمام تحریک چلانے والے بنگالیوں کے فیصلے کے مطابق شہید کا درجہ حاصل کر لیا۔ ایک دن سب کو ہی کو مرنا ہے۔ اگر وہ جلسے میں شریک ہونے سے انکار کرتے اور اپنی ہی قوم کے

ہاتھوں مارے جاتے تو ہمیشہ غدار کہلاتے لیکن اب وہ ہم سب کی نظروں میں شہید ہیں۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا آپ بھی اپنے ابو کی طرح مسلم لیگی ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ میں اسی لئے تو تمہارے بابا کا مرید ہوں کہ وہ مجھے بھی سیاست سے دور رہنے والی عقل کی باتیں سمجھایا کرتے تھے۔ میں ان کے زرّیں اصولوں پر عمل کرتا ہوں۔ وہ کہتے تھے سب کا ساتھ دو لیکن صرف اپنے لئے زندہ رہو۔ سب کی ہاں میں ہاں ملاؤ مگر کرو وہی' جس سے تمہیں خوش حالی اور سلامتی ملتی ہے۔ وہ طبعی عمر تک جینے کے گُر سمجھاتے تھے۔ افسوس جوشیلے سیاستدانوں نے انہیں شہادت کی راہ پر ڈال دیا لیکن میں تو تمام عمر تمہارے بابا کے اصولوں پر عمل کرتا رہوں گا۔ میں نے تمہارے بابا کے سامنے اپنے ابو کو اہمیت نہیں دی اور ان کی طرح مسلم لیگ کا کارکن بننا گوارا نہیں کیا۔"

وہ سن رہی تھی اور متاثر ہو رہی تھی کہ وہ اس کے بابا کو اتنی اہمیت دیتا ہے؟ اتنی اہمیت کہ اپنے باپ سے بھی زیادہ مان مرتبہ دیتا ہے اور ان کے ہی اصولوں پر چل کر سیاست سے دور رہتا ہے اور کاروبار پر اس کی طرح توجہ دیتا ہے۔ وہ بھی لندن سے آنے کے بعد وہاں جاپانی ماہرین کو بلا کر سیاست کو ماند رکھنے اور کاروبار کو چمکانے کے لئے اپنے علاقے میں باقاعدہ فش ہاربر بنانا چاہتی تھی۔

ایک کہانی وہ ہوتی ہے جو پڑھنے کے دوران نہایت دلچسپ ہوتی ہے لیکن پڑھنے کے بعد بھلا دی جاتی ہے۔ ایک کہانی وہ ہوتی ہے جو دلچسپ بھی ہوتی ہے اور جھوٹی بھی ہوتی ہے لیکن اس میں حقیقت کا رنگ اس طرح بھر دیا جاتا ہے کہ وہ کہانی یادگار بن جاتی ہے اور دلوں کے اندر دھڑکنے لگتی ہے۔ شہید مرزا اور قاضی امجد نے مل کر ایسی ہی کہانی بنائی تھی۔ اس کے باپ کے لالچ اور دوغلے پن کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد بھی اس حرام موت مرنے والے کو شہید بنا دیا تھا اور ایسا کر کے بیٹی کے دل میں پیار کی دھڑکنیں پیدا کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک چراغ جلایا تھا۔ وہ چراغ ایک کی قبر پر ٹمٹما رہا تھا اور دوسری کے دل میں پیار کی جوت جگا رہا تھا۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر بولا۔ "آؤ' نئی کوٹھی میں چلیں۔ راستے میں باتیں ہوتی رہیں گی۔"

وہ بھی اٹھ گئی۔ دونوں کوٹھی کے باہر آئے۔ زلیخا اپنی کار میں آئی تھی۔ وہاں قاضی امجد کی بھی کار کھڑی تھی۔ وہ بولا۔ "اگر ہم اپنی اپنی کار میں جائیں گے تو ملاقات کا مزہ جاتا

رہے گا۔"

وہ بولی۔ "آپ اپنی کار یہیں رہنے دیں اور میری کار میں چلیں۔"

"تم بھول رہی ہو۔ یہ کوٹھی فروخت ہو چکی ہے۔ سارا سامان یہاں سے جا چکا ہے۔ صرف یہ کار اور میرا وہ چوکیدار رہ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں' تم اپنے ڈرائیور سے کہو کار لے جائے۔ میں تمہیں اپنی کار میں پھول باڑی پہنچا دوں گا۔"

وہ ذرا سوچ کر بولی۔ "اس سے زیادہ خوشی کی بات میرے لئے کیا ہو گی کہ آپ میرے گھر تک چلیں گے لیکن ایک وعدہ کر لیں کہ رات کا کھانا میرے گھر میں میرے ساتھ کھائیں گے؟"

"میں تمہارے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتا ہوں' تم میرے گھر کو کیا سمجھتی ہو؟"

اس نے ہنس کر پوچھا۔ "آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟"

"جو سامنے آجائے کھا لیتا ہوں' ویسے مجھے ہلسا مچھلی بہت پسند ہے۔"

"پھر تو بات بن گئی۔ میں نے باورچی سے کہا تھا کہ آج وہ ہلسا پکائے۔ میں ڈرائیور کو ذرا اور تاکید کر دیتی ہوں۔"

"تم دس برس تک لندن میں رہیں۔ پھر بھی ہلسا کو نہیں بھلایا؟"

وہ جواباً ہنستی ہوئی ڈرائیور کے پاس گئی اسے کچھ ہدایات دیں پھر پھولوں کا ایک ہار لے کر قاضی کے ساتھ اس کی کار میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ قاضی نے کار اسٹارٹ کی پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا شہید مینار کے پاس آ کر رک گیا۔ وہاں انہوں نے کار سے اتر کر شہید مینار کے پاس آ کر شہید حبیب الرحمان کے نام کے اطراف پھولوں کی مالا چڑھائی۔ زلیخا نے سر پر آنچل رکھا۔ پھر دونوں نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی۔ قاضی امجد جس کی اصلیت کو سمجھتا تھا اس کے لئے بھلا کیا دعا مانگ سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ ہاتھ اٹھائے کھڑا رہا البتہ وہ دل سے دعا مانگتی رہی کہ اس کے بابا بہت اچھے انسان تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ مغفرت کرے اور ان کی روح کو جنت الماویٰ میں رکھے۔

جنت الماویٰ وہ مقام ہے جہاں شہیدوں کی ارواح تا قیامت رہتی ہیں۔ بعض منفی قسم کے دانش ور کہتے ہیں کہ جھوٹ اتنا بولو اتنا بولو اور اتنا بولتے جاؤ کہ وہ سچ بن جائے۔ زلیخا نے خود کو کبھی کسی سے کمتر نہیں سمجھا تھا۔ پھر اپنے باپ کو کسی بھی سچے اور مصدقہ شہید سے کمتر کیسے سمجھ سکتی تھی اس لئے دعا کے دوران اللہ تعالیٰ کو بھی سمجھا رہی تھی

اور یقین کر رہی تھی کہ اس کے بابا کے لئے جنت الماویٰ کا دروازہ کھل چکا ہو گا۔

وہ دعائیں مانگنے کے بعد کار کی طرف واپس آ گئے۔ قاضی نے اس کے لئے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھنے کے لئے آگے بڑھی پھر ٹھٹک گئی۔ جہاں اسے بیٹھنا تھا اسی سیٹ پر ایک لفافہ رکھا ہوا تھا۔ سفید لفافے پر بنگلہ بھاشا میں جلی حرفوں میں زلیخا کا نام لکھا تھا۔

اس نے قاضی کو دیکھ کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے۔ پہلے تو یہاں نہیں تھا؟"

قاضی نے انجان بن کر اِدھر اُدھر دور تک نظریں دوڑائیں۔ وہ جانتا تھا کہ لفافہ وہاں شہید مرزا چھوڑ گیا ہے۔ اس نے لفافہ اٹھا کر کہا۔ "تمہارے کسی جاننے والے نے اسے یہاں رکھا ہے۔ شاید وہ تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے کہیں جا کر چھپ گیا ہے۔"

اس نے ناگواری سے لفافے کو قاضی کے ہاتھ سے جھپٹ کر اسے مٹھی میں بھینچتے ہوئے کہا۔ "میں خوب سمجھتی ہوں۔ یہ خط اسی پاگل کے بچے نے لکھا ہے۔"

اس نے انجان بن کر پوچھا۔ "کس پاگل کے بچے کی بات کر رہی ہو؟"

"وہی جو سڑک کے کنارے بھکاریوں کی طرح کھڑا رہتا ہے اور اسے عشق سمجھتا ہے۔ اپنا نام شہید مرزا بتاتا ہے۔"

قاضی نے اس کے ہاتھ سے مڑے تڑے لفافے کو لے کر کہا۔ "اس دیس میں سیکڑوں شہید مرزا ہوں گے۔ اسے پڑھ تو لو کہ اس نے کیا لکھا ہے؟"

"میں تو اس کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ اس کے خط پر لعنت بھیجتی ہوں۔ آپ پڑھ کر معلوم کریں کہ اس نے کیا بکواس کی ہے؟"

قاضی نے لفافے کو چاک کیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹی سی پرچی تھی۔ اس پر تحریر بھی مختصر سی تھی۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔

"ہمارے دینِ اسلام میں شہادت کا درجہ سب سے بلند ہے' اسے جھوٹی کہانی یا مذاق نہ بناؤ۔"

یہ پڑھتے ہی دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ جیسے وہ چور تھے اور ان کی چوری کھل گئی تھی۔ کوئی کب اپنے چور ہونے اور فریب دینے کا اقرار کرتا ہے۔ وہ قاضی کے ہاتھ سے پرچی لے کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے بولی۔ "یہ اسی دشمن نے

لکھا ہے جو خود کو شہید مرزا کہتا ہے۔"

قاضی نے کہا۔ "وہ دشمنی نہیں کرے گا۔ تم کہہ رہی تھیں کہ وہ ایک دیوانہ ہے۔ اگر تمہارا دیوانہ ہے تو تمہیں دکھ پہنچانے والی کوئی بات نہیں کرے گا۔"

"تو پھر کون ہے جو ہم پر کیچڑ اچھال رہا ہے؟"

"کوئی بھی مخالف ہو سکتا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہو گا کہ یونیورسٹی میں جب اسٹوڈنٹس یونین کے دو مسلمان مخالف گروہ ایک دوسرے سے لڑتے ہیں اور ایسے میں کوئی جان سے مارا جاتا ہے تو مرنے والے کے گروہ کے مسلمان اسے شہید کہتے ہیں لیکن دوسرے گروہ کے مسلمان فاتحانہ انداز میں کہتے ہیں کہ انہوں نے مرنے والے مسلمان اسٹوڈنٹ کو جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ دشمن شہید پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ چلو آؤ' ان کی پروا نہ کرو۔"

وہ باتیں بنا کر اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر نئی کوٹھی کی طرف جانے لگا۔ جب حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرنی ہوتی ہیں تو اسی طرح باتیں بنائی جاتی ہیں ورنہ سچ اور جھوٹ کو سمجھنے کے لیے کلامِ پاک ہے' اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور راہنمائی ہے۔ اگر علمائے کرام سے رجوع کیا جائے تو وضاحت سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو شہادت کا درجہ کیسے حاصل ہوتا ہے؟

لیکن ہوتا یوں ہے کہ مفادات حاصل کرنے' اپنے اختیارات کو وسعت دینے' اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے یا پھر اپنی بات کو درست منوانے کے لیے منافق کی موت کو شہادت کہہ کر اس کی شہید کی حیثیت سے تشہیر کی جاتی ہے۔ اس تشہیر کی مخالفت کرنے والے علمائے دین کو کانٹوں پر گھسیٹا جاتا ہے اور حمایت کرنے والے علما کو سر پر بٹھایا جاتا ہے جو فرعونی حکومت کے خلاف کلمۂ حق بلند کرنے والے کو غدار کہہ کر موت کی سزا دینے پر خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ یہ سارا کھیل سیاست کا ہوتا ہے۔ جو اقتدار میں ہو وہ اپنے مرنے والے کو شہادت کا درجہ دیتا ہے اور اپوزیشن کے مرنے والے کو غدار کا فتویٰ جبراً دلاتا ہے۔ اس لیے علامہ اقبال نے کہا ہے کہ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی............

ان کی کار ڈھاکا شہر کی طرف جا رہی تھی۔ زلیخا کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ "اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ دشمن تو کیچڑ اچھالتے ہی ہیں۔ وہ تمہارے بابا کے

خلاف اپنی بات کو درست ثابت نہیں کر سکتے کیونکہ جلسے میں تو ان کے شہادت پانے کی گواہی دینے والے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ہیں۔"

"آپ اسی سلسلے میں کراچی گئے تھے۔ یہاں تحریک چلانے والوں کو غدار کہا جا رہا ہے۔ ایسے میں آپ تنہا کیا کرتے رہے؟"

"میں بے شک تنہا ہوں لیکن تم بھول رہی ہو کہ میرے ابو مسلم لیگ کے اہم سیاست داں تھے۔ موجودہ حکومت کے دو وزیروں نے مجھے حوصلہ دیا ہے۔ وہ میرے ابو کی خدمات کو سراہتے ہیں۔ انہوں نے میری درخواست پر اتنا کیا ہے کہ تمہارے بابا کے نام کو غداروں کی بلیک لسٹ سے خارج کرا دیا ہے۔"

وہ بولی "لیکن حکومت کے ریکارڈ میں انہیں شہید تسلیم کیا جانا چاہیے۔"

"یہ بھی ہو جائے گا۔ انہوں نے مجھے سمجھایا ہے کہ ہم تمہارے بابا کو شہید کہہ سکتے ہیں۔ اپنی زمین پر ان کا شہید مینار بنانے پر انہوں نے اعتراض نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا ہے ہم موجودہ تحریک کے حوالے سے انہیں شہید نہ کہیں۔ اس لیے میں نے شہید مینار پر تمہارے بابا کا نام کندہ کرایا ہے لیکن یہ نہیں لکھوایا کہ وہ بنگلہ بھاشا کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے قربان ہوئے تھے۔"

"اس طرح تو میرے بابا قومی ہیرو نہیں کہلائیں گے۔"

"ملک کے سیاسی حالات بدلتے رہتے ہیں۔ جب ہمارا پلڑا بھاری ہو گا تو ہم شہید مینار میں ان کے ہیرو ہونے کی وضاحت کندا کرا دیں گے۔"

وہ دونوں نئی کوٹھی کے احاطے میں پہنچ کر کار سے اتر گئے۔ وہ کوٹھی اتنی وسیع و عریض اور شاندار تھی کہ اسے دیکھ کر ایک محل کا گمان ہوتا تھا اور اس کے مالک کی امارت و شان و شوکت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ زلیخا تو سحرزدہ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اندر پہنچ کر رقص کے انداز میں گھوم گھوم کر ایک ایک حصے کو اور وہاں کے مہنگے آرائشی سامان کو دیکھنے لگی پھر بولی "یہ........ یہ آپ کی کوٹھی ہے؟"

وہ بولا۔ "نہیں، ہماری کوٹھی ہے۔"

وہ مسکرائی پھر شرماتی ہوئی اس کے بازو سے آ کر یوں لگ گئی جیسے اس کوٹھی کو "ہماری" ہونے کی منظوری دے دی ہو۔ قاضی نے کہا۔ "تمہارے آنے سے پہلے سوچتا تھا میرا کاروبار جو یہاں سے چاٹگام کی بندرگاہ تک پھیلا ہوا ہے اور جو دولت میں کما ر

ہوں، یہ سب آخر کس کے لیے ہے لیکن تمہارے قریب آنے سے مجھے اپنے بہت سے سوالوں کا جواب کا مل گئے ہیں۔"

"میں بھی مچھلیوں کے کاروبار کو بیرونی ممالک پہنچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں نے جاپانی ماہرین سے مشورہ لیا تھا۔ انہوں نے نہایت معقول اور دانش مندانہ مشورے دیئے ہیں۔ اس لیے میں پھول باڑی کے دریا کو باقاعدہ فش ہاربر بنانا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے آپ کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لیے آپ سے مشورہ لوں گی۔"

"ابھی تو ہم پھول باڑی جا رہے ہیں۔ وہاں رات کے کھانے کے بعد اتنی دیر ہو جائے گی کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔"

"میں رات کے وقت تنہا پچاس میل کا سفر کرنے نہیں دوں گی۔ آپ میری حویلی میں رہیں گے۔"

"میں یہی کہنے جا رہا ہوں کہ کل دن کے وقت وہاں کا علاقہ اور دریا وغیرہ دیکھوں گا۔ کاروباری نقطۂ نظر سے جائزہ لوں گا پھر اپنی بساط کے مطابق مشورے دوں گا۔ آؤ ہم چلیں۔"

وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ "یہ کوٹھی قدم قدم پر ایسی لگتی ہے جیسے میں نئے دور کے شیش محل میں چل رہی ہوں۔ سچ پوچھیں تو میرا یہاں سے جانے کو جی نہیں کرتا ہے۔"

"جب یہ ہماری ہے تو پھر ہماری ہی ہے۔ تم میری شریکِ حیات بن جاؤ گی تو پھر کبھی یہاں سے نہ جانا۔ آخر دنیا والوں کو بھی قائل کرنا ہے، تم یہاں آجانے کے بعد کیوں نہیں جا رہی ہو۔"

وہ کوٹھی سے نکل کر کار میں آئے پھر وہاں سے پھول باڑی کی حویلی میں پہنچ گئے۔ زلیخا کو اب اپنی حویلی کھنڈر جیسی لگ رہی تھی۔ وہ بولی۔ "آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کس پرانی حویلی میں لے آئی ہوں۔"

"یہ حویلی تمہارے لیے پرانی ہو گی لیکن میرے لیے میری شہری کوٹھی سے بھی زیادہ خوبصورت اور مہنگی ہے کیونکہ یہ تمہاری ہے اور تم وہ ہو جو کبھی پرانی نہیں ہو گی، ہمیشہ سدا بہار رہو گی۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے کھانے کی میز پر آئے۔ وہاں کئی قسم کی ڈشیں تھیں لیکن ہلسا

مچھلی کی ڈشیں زیادہ تھیں۔ ان مچھلیوں کو تین مختلف طریقوں سے پکایا گیا تھا۔ دونوں نے ان ہی تین ڈشوں سے زیادہ مچھلیاں لے کر کھائیں۔ مچھلیاں پانی سے باہر نکالی جائیں تو خشکی میں پانی کے بغیر پھڑپھڑاتی ہیں پھر کاٹنے کے بعد سدا کے لیے خاموش ہو جاتی ہیں۔ ہلسا کی خوبی یہ ہے کہ کاٹ چھانٹ کر پکانے کے بعد وہ حلق سے اترنے کے بعد پھڑپھڑا کرتی ہے۔ جس میں نشہ نہ ہو' وہ شراب نہیں ہوتی۔ جس میں حرارت اور تحریک نہ ہو وہ ہلسا نہیں ہو سکتی۔

وہ دونوں کھانے کے بعد رات کو دیر تک حویلی کی چھت پر ٹہلتے رہے۔ یہ نظروں دھوکا ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ چلتے پھرتے وقت بھی پھڑپھڑاتے ہوئے سے لگنے لگتے ہیں چاندنی رات تھی۔ مستانہ ہوا چل رہی تھی۔ وہ بات سے بات نکال کر دیر تک ساتھ ر کا جواز پیدا کرتے رہے۔ کبھی وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھام لیتے تھے' کبھی قری آتے آتے دور ہو جاتے تھے۔ دو مریضوں کو ایک ہی جیسی خوراک کھلائی جائے تو تا بھی ایک جیسی ہوتی ہے۔

دوسرے دن قاضی نے زلیخا کے ساتھ پھول باڑی کی سیر کی۔ ساحلی علاقے کو د تک دیکھا پھر کہا۔ "جاپانی ماہرین نے عمدہ مشورہ دیا ہے۔ یہاں بڑے پیمانے پر مچھلیوں ا کیکڑوں کا بہت ہی منافع بخش کاروبار ہو سکتا ہے لیکن یہاں بجلی برائے نام ہے۔ یہ مچھلیوں اور جھینگوں کے لئے کولڈ اسٹوریج کی ضرورت ہو گی۔ کیکڑوں کے گوشت سوپ کی الگ الگ پیکنگ کے لیے بھی دن رات بجلی کی ضرورت ہے۔"

وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں یہاں ایک بہت بڑے بجلی گھر کی ضرورت ہے۔ باقا فش ہاربر بنوانا ہو گا۔ میں نے حکومت کے اس شعبے میں درخواست بھیجی ہے اور یہاں دریا سے نکالے ہوئے تمام مال کی بیرونی ممالک میں منڈی بنانے اور مختلف پہلوؤں حکومت کو بھی فائدہ پہنچانے کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حکومت طرف سے بھاری مالی امداد قرضے کے طور پر حاصل ہو سکے گی۔"

"تم اچھا کاروباری ذہن رکھتی ہو۔ ویسے یہ سرکاری محکمے والے بہت دوڑاتے ہیں تمہیں قرضہ حاصل کرنے میں چھ ماہ لگ سکتے ہیں بلکہ سال بھر کا عرصہ بھی لگ سکتا۔ لیکن میں تو اپنے ہی سرمائے سے کام کرتا ہوں۔ تیج گاؤں میں میری جو زمینیں ہیں میں ایک بہت بڑی سپر مارکیٹ بنا رہا ہوں۔ ایئرپورٹ سے ڈھاکا شہر جانے کے لیے ا

بڑی شاہراہ سے گزرنا پڑتا ہے جہاں وہ سپر مارکیٹ بنے گی۔ بیرونی ممالک سے آنے والے اس جدید طرز کی مارکیٹ میں ضرور آئیں گے۔ ایک اندازے کے مطابق مجھے ہر ماہ کم از کم ایک لاکھ کا منافع ہوا کرے گا۔"

"ایک لاکھ روپے ماہانہ؟" زلیخا حیران رہ گئی۔ ان دنوں ایک لاکھ روپے ایسے تھے جیسے قارون کا خزانہ ہو۔ زلیخا کو اپنی فش ہاربر والی اسکیم پھیکی پھیکی سے نظر آنے لگی۔ چھ ماہ یا سال بھر تک سرکاری قرضے کا انتظار کرنے سے بہتر تھا کہ وہ جلد از جلد اس کی شریکِ حیات بن جاتی۔ نکاح میں صرف تین بار قبول کہہ کر قاضی امجد کے تمام کاروبار اور ان سے حاصل ہونے والے تمام منافع کی حقدار بن سکتی تھی۔ وہ مالک ہوتا اور یہ مالکن کہلا سکتی تھی۔

پھول باڑی کے بہت سے بزرگوں اور سیاست میں حصہ لینے والوں نے اس روز قاضی امجد کو دیکھ کر کہا کہ یہ وہی شہید مرزا ہے جو پلٹن میدان کے جلسے سے اس کے بابا کی لاش لے کر آیا تھا۔ یہ سارے ثبوت اور گواہ ایسے تھے کہ وہ قاضی پر کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکتی تھی۔

ایک بھروسا کرنے والی کو فریب دینا کوئی اچھا عمل نہیں تھا۔ شہید مرزا کبھی ایسا نہ کرتا لیکن اس کے باپ نے جانی دشمن بننے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ مرزا نے اس کا حربہ اسی پر استعمال کر کے انتقام لیا تھا' اس کی بیٹی سے دشمنی نہیں کرنا چاہتا تھا وہ تو اسے محبت سے اپنانا چاہتا تھا لیکن اس نے محبت کے پہلے تحفے پر تھوک کر اسے شدت سے یہ احساس دلایا تھا کہ وہ ایک چوکیدار کا نواسا ہے۔ ماں کی طرف سے ایسا ادنیٰ ہے کہ حبیب الرحمان اسے داماد نہیں بنانا چاہتا تھا اور زلیخا بھی اپنے باپ کی طرح اسے دو کوڑی کا سمجھتی ہے اور صرف اسے نہیں اپنے ڈرائیور اور ملازموں کو بھی کتا' کمینہ اور نہ جانے کیا کچھ کہتی تھی۔ وہ مغرور ضدی اور خود سر تھی۔ وہ صرف اپنی ذات اور دولت کو اہم سمجھتی تھی۔ اس کے بعد کسی اور کو انسان سمجھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔

اس کے بابا کے بتائے ہوئے زریں اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی تھا کہ کہیں سے بہ آسانی منافع حاصل ہو رہا ہو اور راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو وہ منافع فوراً حاصل کر لو۔ اگر وہ دیر کرے گی تو کوئی دوسرا اس منافع کو حاصل کرنے والا پیدا ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے دیر نہیں کی۔ شام تک قاضی سے اتنی گہری محبت اور اپنی تنہائی کا اظہار

کیا کہ قاضی نے بھی اپنی تنہائی کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ دونوں نے اسی ہفتے شادی کی بات آپس میں طے کرلی۔ پھر وہاں کی پنچائت کے بزرگوں کو بلا کر کہہ دیا کہ وہ اگلے جمعے کو شادی کر رہے ہیں۔

پھر زلیخا نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کا کاروبار اور زمینیں دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نے بڑی محتاط زندگی گزارنا سیکھی تھی۔ شادی سے پہلے تمام زمینیں' جائداد وغیرہ دیکھنا چاہتی تھی۔ قاضی نے کہا۔ "تم پرسوں شہر کی کوٹھی میں آجاؤ۔ پھر میں تمہیں اپنا کاروبار وغیرہ سب کچھ دکھاؤں گا۔"

اس نے شہر آکر شہید مرزا سے ملاقات کی اور تمام حالات بتائے۔ اس نے کہا "مبارک ہو۔ وہ تمہارے نصیب میں تھی' تمہیں مل رہی ہے۔ جاؤ' موج کرو۔ اسے میرا تمام کاروبار دیکھ لینے دو۔"

"میں ڈرتا ہوں کہ اسے میری اصلیت معلوم ہوگی تو وہ شادی بھی نہیں کرے گی اور میری بڑی انسلٹ کرے گی۔"

"تمہاری ایک عزت اور مقام ہے۔ تم میرے دستِ راست ہو۔ یہاں کے تمام کاروبار کی نگرانی کرتے ہو۔ وہاں کوئی تمہارا نام لے کر تمہیں مخاطب نہیں کرتا ہے۔ سب تمہیں "سر" کہتے ہیں۔ ایسے میں یہی ظاہر ہوگا کہ وہ اپنے مالک کو سر کہہ رہے ہیں۔"

یہ درست تھا۔ شہید مرزا کے تمام ملازم قاضی امجد کو جھک جھک کر سلام کرتے اور اگر کوئی بزرگ افسر اسے قاضی صاحب کہہ دیتا تب بھی بھید نہ کھلتا۔ زلیخا کو پہلے سے معلوم تھا کہ وہ قاضی کے نام سے زیادہ جانا پہچانا جاتا ہے۔

پھر زلیخا کے دیکھنے کے لیے تھا ہی کیا؟ پٹ سن کے چھ بڑے گودام اور وہاں کے چوکیدار تھے۔ انہوں نے زلیخا اور قاضی کو دیکھ کر سلام کیا۔ گودام کے دروازے کھول کر اسے مال کا اسٹاک رجسٹر دکھایا۔ جس فیکٹری میں پٹ سن کی کوالٹی کی درجہ بندی ہوتی تھی وہاں پٹ سن کے ریشے دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑتے تھے۔ وہاں کی فضا غبار آلودہ ہوتی تھی۔ زلیخا کار کے شیشے بند کیے بیٹھی رہی۔ باہر نہیں نکلی' شیشے کے پار دیکھتی رہی۔ وہاں کے افسران نے اسے دیکھ کر سلام کیا اور کاروبار کے سلسلے میں کچھ دیر گفتگو کرتے رہے پھر وہ کار کے اندر آکر دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "اندر چل کر یہ نہیں دیکھو گی مشینوں سے کس طرح اعلیٰ کوالٹی کا پٹ سن الگ کیا جاتا ہے۔"

وہ باہر نکلتی تو غبار آلود فضا سے اس کا میک اپ بگڑ جاتا۔ وہ بولی۔ "نہیں' یہاں بہت گرد اڑ رہی ہے۔ میں تو بس یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی ہوں کہ آپ نے کاروبار کتنا پھیلا رکھا ہے۔"

اس نے ڈھاکا سے ایئرپورٹ جانے والی شاہراہ کے کنارے تیج گاؤں کی وہ دکانیں اور زمینیں بھی دیکھیں جہاں وہ ایک جدید طرز کا شاپنگ پلازا بنانے والا تھا۔ زلیخا اس تمام کاروبار اور زمین جائداد وغیرہ کی خود ہی چشم دید گواہ تھی۔ کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی اس لیے اگلے جمعے کو اس کی دلہن بن گئی۔

☆======☆======☆

وہ ایزی چیئر پر بیٹھا سامنے میز پر رکھی ہوئی تصویر دیکھ رہا تھا۔ اب وہاں زلیخا کی تصویر نہیں رہی تھی۔ اس کی جگہ ماں کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ اس نے ٹیبل فریم سے زلیخا کی تصویر نکال کر جلا دی تھی۔

عشق خود جلتا ہے معشوق کو نہیں جلاتا۔ ویسے اس نے محض تصویر جلائی تھی ورنہ زلیخا خود ہی جلنے کڑھنے کے راستے پر چل نکلی تھی۔ ایسے وقت اس نے تجزیہ کیا تھا کہ عشق کے مفہوم میں بڑی وسعت اور گہرائی ہوتی ہے اور شہید مرزا نے زلیخا کی جو تمنا کی تھی اس میں ایسی وسعت و گہرائی اس لیے نہیں تھی کہ وہ اپنی ماں کی خواہش پر اس کی تمنا کرتا رہا تھا۔

اور جب یہ معلوم ہوا کہ حبیب الرحمان نے اس کی ماں کو احساسِ کمتری میں مبتلا رکھنے کے لیے اسے ایک چوکیدار کی بیٹی کہا ہے تو یہ خواہش اور شدت اختیار کر گئی کہ وہ زلیخا کو ماں کی بہو بنا کر کمتری کے احساسات کو دور کرے گا لیکن باپ کی طرح بیٹی بھی ایسا احساسِ برتری رکھتی تھی جیسے اپنے سے چھوٹے لوگوں کو انسان ہی نہ سمجھتی ہو۔ ہماری زمین پر ہر شخص کو دوسرے سے ذرا اونچا اور افضل رہنے کی تمنا ہوتی ہے۔ شہید مرزا نے قاضی کے ذریعے زلیخا کی تمنا پوری کر دی تھی۔

لوگ اس لیے غلطی کرتے ہیں کہ جو کرتے ہیں اسے غلطی نہیں سمجھتے۔ اپنی تربیت‘ اپنے ماحول اور اپنے مزاج کے مطابق اسے درست سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے باپ دادا اور پردادا کے زمانے کی باتیں سنتی آئی تھی اور دیکھتی بھی آئی تھی کہ وہ اپنی زمینوں کے مالک ہی نہیں‘ حکمران بھی ہیں اور ان زمینوں پر رہنے والے کسان اور ماہی گیر صرف ان کی رعایا ہی نہیں بلکہ کیڑے مکوڑے بھی ہیں‘ جب چاہو انہیں کچلتے ہوئے آگے بڑھ جاؤ۔

یہ درست ہے کہ اللہ جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے لیکن محنت و مشقت کرنے والے‘ اپنی شرافت کو برقرار رکھنے والے اور اللہ کے سامنے سجدے کرنے والے غریب عوام ذلیل نہیں ہوتے۔ ان پر برتری قائم رکھنے والے چند لوگ

انہیں اس قدر ذلیل اور احمق سمجھتے ہیں کہ وہ ٹین یا گھاس پھوس کی چھت کے نیچے بارش میں بھیگتے ہوئے نماز پڑھتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ان غریبوں کا مقدر ہی ایسا ہوتا ہے کہ انہیں نمازیں بھی بارش میں بھیگ کر اور دھوپ میں جل جل کر پڑھنا نصیب ہوتی ہیں۔

وہ دلہن بن کر ڈھاکا کی محل نما کوٹھی میں گئی۔ وہاں دو دنوں تک مسرت بھرے لمحات گزارے۔ تیسرے دن وہ قاضی کے ساتھ پھول باڑی آئی۔ وہاں بے شمار لوگ انہیں مبارک باد دینے آئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور بزرگ حضرات کے علاوہ سیاست سے تعلق رکھنے والے چند بوڑھے اور جوان کارکن بھی تھے۔ وہ سب آتے رہے اور زلیخا اور قاضی کو سلام کر کے جاتے رہے۔ سب سے آخر میں مسجد کمیٹی کے ارکان اور چند مولوی حضرات آئے۔ زلیخا نے ناگواری سے انہیں دیکھا لیکن اپنی بھاشا میں ناگواری ظاہر نہیں کر سکتی تھی اس لیے قاضی سے انگریزی میں بولی۔ ”یہ لوگ تو مصیبت بن گئے ہیں۔“

قاضی نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”یہ لوگ پکی اینٹوں کی بڑی سی مسجد تعمیر کرانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے پورے علاقے میں دور تک چار بانسوں کی مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ آپ انہیں زیادہ نہ بولنے دیں۔ کسی طرح جلدی ٹال دیں۔“

”بانسوں کی مسجدیں؟“ اس نے سوچنے کے انداز میں پوچھا۔ ”بارش اور سیلاب میں تو وہ مسجدیں بہہ جاتی ہوں گی۔“

”تو کیا ہوا؟ بانس زیادہ مہنگے نہیں ہوتے۔ مسجدیں دوبارہ بنا لی جاتی ہیں۔ یہ تو پکی اینٹوں کی چار دیواری اور پکی مسجد کی چھت بنانے کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ انہیں لاکھ سمجھاؤ لیکن اپنی اوقات سمجھتے ہی نہیں۔“

قاضی نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ ”ان کی اوقات نہیں ہے‘ ہماری تو ہے۔ تم جس کوٹھی میں دلہن بن کر گئی ہو وہ بیس لاکھ روپے کی ہے۔ تم نے فش ہاربر کے لیے لاکھوں روپے کا بجٹ بنایا ہے۔ میرے شاپنگ پلازا میں اس سے بھی زیادہ رقم خرچ ہو گی۔ پھر ہم ایک پختہ مسجد کیوں نہیں بنا سکتے؟“

”آپ بزنس اور مذہب کو الگ الگ رکھیں۔ میں نے بہت پہلے کبھی علامہ اقبال کا

ایک شعر سنا تھا۔ وہ شعر تو یاد نہیں ہے لیکن اس کا مفہوم یہ تھا' اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتی جب تک وہ قوم خود اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہیں کرتی۔ آپ ہی سوچیں جو گدھے ہیں وہ کیا کوشش کریں گے؟ وہ تو تمام عمر محنت کریں گے' ہم زیادہ سے زیادہ ذہانت سے کام لیتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ دولت کماتے ہیں اور عوام زیادہ سے زیادہ محنت کرتے اور بوجھ اٹھاتے ہیں اور بوجھ اٹھاتے اٹھاتے مرجاتے ہیں۔"

وہ محبت سے سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "جولی! ہم اپنی بنگالی قوم کو صدیوں سے جانتے ہیں۔ یہ مشکل سے آدھا پہنتے ہیں' آدھا کھاتے ہیں اور اس کے لیے بھی نمازِ شکر ادا کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کا شعر ان غریبوں کے لیے نہیں' ہمارے جیسے دولت مند اور بااختیار بنگالیوں کے لیے ہے۔ ہم اپنی قوم کی حالت بدل سکتے ہیں۔"

"آپ نے تو میری ہی بات پکڑ لی ہے۔ مجھے صرف اپنی' آپ کی اور اپنی اولاد کی خوش حالی کو اونچے گراف پر لے جانا ہے۔ میں جنت میں گھر بنانے کے لیے اپنی ہونے والی اولاد کو زمین پر ننگا بھوکا یا کسی کا محتاج نہیں رکھوں گی۔ ہم آج بچائیں گے تو کل ہماری اولاد کے کام آئے گا۔ پلیز کسی طرح باتیں بنا کر انہیں ٹال دیں۔ اس علاقے میں جب بھی کوئی زمیندار یا آپ جیسا مالک آتا ہے' یہ لوگ ہاتھ پھیلانے چلے آتے ہیں۔"

زلیخا نئی دلہن تھی۔ نئی بہار تھی۔ قاضی نے اسے ایسے حاصل کیا تھا جیسے زمین پر کھڑے رہ کر آسمان سے ایک تارہ توڑ لایا ہو۔ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سامنے بیٹھے ہوئے مسجد کمیٹی کے ممبران' بزرگوں اور مولویوں کو دیکھا پھر ذرا جھجکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "آپ کی مالکن مجھے انگریزی میں آپ کے مسائل سمجھا رہی تھیں۔ ان سے سمجھنے کے بعد میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس علاقے میں ہزاروں لوگ ہیں۔ آپ ہر ماہ ہر گھر سے چندہ کیوں نہیں وصول کرتے؟"

ایک بزرگ نے کہا۔ "آپ نے سارے ہی ننگے بھوکوں کو دیکھا ہے۔ کھانے کے لیے مشکل سے ایک یا دو وقت دال بھات مل جاتا ہے۔ یہ لوگ کیا چندہ دیں گے۔ کبھی پیسہ دو پیسے یا آنہ دو آنے دے دیا کرتے ہیں۔ جب انگریز کا زمانہ تھا تب سے چندہ وصول کر رہے ہیں۔ اب یہ پاکستان ہے' مسلمانوں کا اپنا ملک ہے۔ فرنگیوں کے زمانے سے اب تک چندے کے طور پر تین ہزار چار سو چار روپے جمع ہوئے ہیں۔ چوری کا ڈر رہتا ہے اس لیے ہم نے مالکن کی پکی حویلی میں یہ رقم رکھوائی ہے۔"

زلیخا نے کہا۔ "ہاں' وہ امانت میرے پاس ہے۔ جب بھی مسجد کی تعمیر شروع ہو گی میں اپنی طرف سے اس رقم میں دو سو روپے زیادہ کر کے دوں گی۔"

قاضی نے چونک کر شرمندگی سے زلیخا کو دیکھا۔ صرف دو سو؟ یہ دو سو ان غریبوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی دین تھے لیکن زلیخا جیسی دولت مند کے لیے تو پاؤں کی جوتی تھے۔ قاضی نے کہا۔ "دیکھئے' آج مجھ سے آپ لوگوں کی پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ آپ مجھے بھی اپنی مسجد کمیٹی کا ایک رکن بنا لیں۔"

سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ ایک مولوی نے کہا۔ "آپ کمیٹی میں شامل ہو کر مسجد کی تعمیر میں دلچسپی لیں گے' ہمارے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو گی؟"

"ایک پختہ چھت اور پختہ دیواروں کی مسجد کے لیے کم سے کم پچاس ہزار روپے خرچ ہو سکتے ہیں۔ اگر مسجد کے ساتھ مدرسہ اور دینی معلومات کی ایک لائبریری بھی بنوائی جائے تو اس علاقے کے بچوں کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔"

سب لوگ تعریفیں کرنے لگے۔ اسے دعائیں دینے لگے۔ اس نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ چند ماہ کے اندر اس مسجد کے لیے کم از کم پچیس ہزار روپے لے آؤں گا۔"

وہ سب لوگ جو فرش پر بیٹھے ہوئے تھے' خوشی سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ اللہ اکبر کے نعرے لگانے کے علاوہ قاضی صاحب زندہ باد کے نعرے بھی لگانے لگے۔ زلیخا کا موڈ بگڑ گیا۔ پچیس ہزار کی رقم معمولی نہیں تھی۔ اس کے سونے کے زیورات کے دو سیٹ آ سکتے تھے۔ وہ سختی سے ہونٹوں کو بھینچے بیٹھی رہی۔ سب کے سامنے قاضی کو کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ اور وہ کہہ رہا تھا۔ "جب ہمارے پاس پورے پچاس ہزار روپے جمع ہو جائیں گے تو ہم مسجد کی تعمیر شروع کریں گے۔ مزید رقم ملنے کی توقع ہو گی تو مسجد کو اور زیادہ وسیع و عریض اور دو منزلہ بنائیں گے۔"

عبادت گزار مسلمانوں کی لیے تو جیسے قاضی نے جنت کے دروازے کھول دیئے۔ وہ سب اس سے مصافحے کر کے دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔ زلیخا پاؤں پٹخ کر غصے سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دروازے کو اندر سے بند کر کے ٹہلنے اور سوچنے لگی کہ قاضی کو اتنی بڑی رقم دینے سے کیسے باز رکھا جائے؟

اس نے دروازے پر آ کر دستک دی پھر کہا۔ "دروازہ کھولو۔"

"میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔ جائیں آپ مسجد کے دروازے پر نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کریں۔"

"تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ میں اتنی بڑی رقم تم سے تو نہیں مانگ رہا ہوں۔"

"آپ کے اکاؤنٹ سے نکالی ہوئی رقم بھی میری ہے۔ میں آپ پر اس لیے حق جتا رہی ہوں کہ آپ سے ہونے والی اولاد کے لیے بچت کرنا چاہتی ہوں۔ ہمیں اپنی نسل کے لئے' اپنے خاندانی وقار کو بلند رکھنے اور اس علاقے میں حکومت کرنے کے لیے جینا ہے۔ ہم نے دنیا والوں کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہے۔"

"جولی! میری جان! میں اتنی بڑی رقم اپنے اکاؤنٹ سے بھی نہیں دوں گا۔ میں ایک بزنس مین ہوں۔ میرا آئیڈیا تو سن لو۔"

وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر بولی۔ "کیا آئیڈیا ہے آپ کا؟"

"اندر تو آنے دو۔ راز کی بات ہے۔"

وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ اس نے اندر آکر دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا۔ "یہ غریب ننگے بھوکے لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اتنی بڑی رقم میں کہاں سے لاؤں گا۔ افسوس کہ تمہارے دماغ میں بھی یہ بات نہیں آئی۔ اب ذرا کان قریب لا کر سنو۔"

کان قریب آئے تو رخسار بھی قریب آتا ہے اور سرشار کر دیتا ہے۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ "یہاں سے چاٹگام تک اتنے مہاجنوں سے کاروباری تعلقات ہیں کہ ہر ایک سے ایک ہزار لوں گا تو پچیس ہزار سے کچھ زیادہ ہی جمع ہو جائیں گے۔ پھر میں وہ تمام رقم مسجد کے چندے کے نام پر انکم ٹیکس کے کھاتے پر لکھواؤں گا تو ہمارے کالے دھن میں پچیس ہزار روپے کا اضافہ ہو جائے گا اور ٹیکس بھی کم لگے گا۔"

وہ خوشی سے اس کے گلے لگ کر بولی۔ "یو آر اے فنٹاسٹک بزنس مین......... نیکی بھی کماؤ گے' انکم ٹیکس بھی بچاؤ گے اور کالے دھن میں اضافہ بھی کرو گے۔"

آدمی کو عورت بہکاتی ہے یا دولت۔ قاضی امجد کو بہکانے کے لیے دونوں ہی مل گئی تھیں۔ شہید مرزا نے اسے نمائشی دولت مند بنا دیا تھا اور اسے رئیسانہ شان و شوکت دکھانے کے لیے ہزاروں روپے دیا کرتا تھا۔ رہنے کے لیے ڈھاکا کی محل نما کوٹھی دی تھی' کار دی تھی اور ایک بریف کیس دیا تھا جس میں اس کی ایک ڈائری' دو چیک بکس اور رقم جمع کرنے کے لین دین کا حساب ہوا کرتا تھا۔ قاضی امجد یہ سب کچھ پا کر شہید مرزا کا

وفادار اب بھی تھا لیکن زلیخا جیسی حسینہ کو جیت کر ہوا میں اڑنے لگا تھا۔ وہ حسین و جمیل چیز' وہ بھی لندن ریٹرن اور دیسی بدیسی حسن کا ایک ایسا مکسچر تھا جسے وہ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا' اسے سچ مچ پا لینے کے بعد تابعداری کی حد تک دیوانہ ہو گیا تھا۔ اسے کسی طرح ناراض کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے اُس نے مسجد کمیٹی والوں کو مطمئن کر دیا تھا اور اپنی کاروباری ذہانت سے زلیخا کو بھی اسی قدر خوش کر دیا تھا۔ وہ بھی اسے خوش رکھنے کی اداؤں سے سرشار کرتی رہی۔

شہید مرزا نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پھول باڑی میں رہے یا ڈھاکا والی کوٹھی میں رہائش اختیار کر لے لیکن اسے تیج گاؤں کے کاروباری علاقے میں نہ لے جائے۔ حالانکہ ڈھاکا والی کوٹھی سے تیج گاؤں کی فیکٹریاں اور زمینیں وغیرہ صرف چھ سات میل کے فاصلے پر تھیں' خود زلیخا کسی وقت بھی ادھر صرف پندرہ منٹ میں پہنچ سکتی تھی اور وہاں کے ملازموں اور افسران سے اسے شہید مرزا اور قاضی امجد کی مختلف شخصیات کا پتا چل سکتا تھا۔ اس لیے قاضی کاروباری معاملات میں زلیخا کو اپنے ساتھ ڈھاکا سے چاٹگام تک لے جاتا تھا اور اس کے ساتھ واپس آتا تھا۔ اس طرح بھید کھلنے کا اندیشہ کم ہو جاتا تھا۔

وہ شہید مرزا کی ہدایات پر عمل کرتا تھا لیکن اسے زلیخا سے جو محبت مل رہی تھی وہ شہید مرزا سے ملنے والی محبتوں اور مہربانیوں سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ وہ تو اس کے پاس پہنچ کر مرزا اور ساری دنیا کو بھول جاتا تھا۔ وہ بچپن سے محبت کا بھوکا تھا۔ اس لیے بھوک وہی مٹاتی تھی۔ دولت اور عورت ایک ساتھ ملتی رہے تو مرد دولت کو عورت پر لٹاتا ہے مگر اپنی عورت کو نہ کسی پر لٹاتا ہے اور نہ ہی اسے کسی سے کمتر ہونے دیتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی زلیخا کی بہت سی باتیں شہید مرزا سے بھی چھپانے لگا۔ وہ لاکھ اس کا محسن سہی لیکن زلیخا گھر کی عزت تھی۔ اس کی محبت کا متبادل کوئی اور نہیں تھا۔ پھر یہ کہ قاضی نے اور مرزا نے اپنی اپنی قسمت آزمائی تھی۔ دونوں نے آسمان کے چمکتے ہوئے ستارے کو توڑ لانا چاہا تھا۔ اس میں شہید مرزا ناکام رہا اور قاضی کامیاب ہو گیا۔ اس لیے زلیخا صرف اس کی محبت اور عزت ہی نہیں بلکہ ایک فخر تھی۔ اس نے جیتے ہوئے تمغے کے طور پر اسے دل میں سجا رکھا تھا۔

گیارہ ماہ بعد محبت کا رزلٹ آؤٹ ہوا۔ زلیخا نے اسے ایک بیٹے کا باپ بنا دیا۔ شہید

مرزا نے اسے مبارک باد دی اور دس ہزار روپے دے کر کہا۔ "تم نے پھول باڑی کی مسجد کمیٹی والوں سے وعدہ کیا تھا کہ پچیس ہزار روپے مسجد کی تعمیر کے لیے چندہ دو گے۔ اس مبارک موقعے پر اس چندے کی پہلی قسط دس ہزار لے جا کر دو' تمہارے بیٹے کو بہت سی دعائیں ملیں گی۔"

قاضی نے وہ دس ہزار روپے لیے پھر ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے قاضی کو غور سے دیکھا پھر پوچھا۔ "ایسی کیا بات ہے کہ یوں تکلف سے عرض کرنا چاہتے ہو؟ جبکہ میں نے تمہیں کبھی ملازم یا ماتحت نہیں سمجھا۔ ہم ایک دوسرے کے راز دار ہیں۔ بولو کیا بات ہے؟"

"وہ بات اصل میں یہ ہے کہ وہ اب مجھے دل و جان سے چاہنے لگی ہے۔ میں صبح کوٹھی سے نکلتا ہوں تو میرے ساتھ آتی ہے اور میرے لیے کار کا دروازہ کھولتی ہے۔ پھر شام کو جب تک واپس نہیں آتا ہوں تب تک دروازے کے باہر کھڑی میری راہ تکتی رہتی ہے۔ وہ میری اتنی عادی ہو گئی ہے کہ اب میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"یہ تم اپنی رومانی داستان سنا رہے ہو' اصل بات کیا ہے' وہ بتاؤ۔"

"وہی بتانے جا رہا ہوں۔ وہ مجھ سے اتنی سچی محبت کرنے لگی ہے کہ اب میں اس سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتا۔ آپ خود سوچیں' یہ بات کب تک چھپی رہے گی۔ آج نہیں تو کل اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اتنے بڑے کاروبار اور اس محل نما کوٹھی کے مالک آپ ہیں۔ میرا نام کبھی شہید مرزا تھا' اور نہ اب ہے۔"

مرزا نے زیر لب مسکرا کر پوچھا۔ "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ تم سے سچی محبت کرتی ہے؟"

وہ ذرا ہچکچایا پھر بولا۔ "میں آپ کو سمجھا نہیں سکوں گا۔ آپ نے شادی نہیں کی ہے۔ آپ ایک بیوی کے پیار کو سمجھ نہیں پائیں گے۔ پھر یہ کہ وہ میرے ایک بیٹے کی ماں بن گئی ہے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ رشتے کی یہ زنجیر کتنی مضبوط ہوتی ہے۔"

"تمہاری یہ بات درست ہے کہ میں نے شادی نہیں کی ہے لیکن یہ خوش خبری سنا دوں کہ اگلے جمعے کو ایک دلہن لا رہا ہوں۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ یہ شادی کا چکر کب سے چلا رہے ہیں اور آج

بتا رہے ہیں؟"

"میں نے کل رات ہی کو فیصلہ کیا تھا۔ اب تک اپنے درجنوں کاروباری اور اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے دوستوں کو فون پر اطلاع دے چکا ہوں۔ کئی دوستوں سے روبرو بھی کہا ہے۔ سب تمہاری طرح حیران ہیں۔"

"خوشی کی بات ہے لیکن آپ نے اچانک کہہ کر حیران کر دیا ہے۔"

"یہی تو بات ہے کہ تمام دوست خوشی کا اظہار کرنے اور مجھے مبارک باد دینے کے بعد بھی حیران ہیں کیونکہ میں ایک کروڑ پتی بزنس مین ہو کر ایک چوکیدار کی بیٹی سے شادی کر رہا ہوں۔"

قاضی نے چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر مسکرا کر کہا۔ "سر! آپ بہت عظیم ہیں۔ سب لوگ حیران ہوں گے کہ آپ ایک غریب لڑکی سے شادی کر رہے ہیں۔"

"کیا تم بھی حیران ہو؟"

"جی نہیں۔ میں جانتا ہوں' آپ انسان دوست ہیں۔ خواہ امیر ہو یا غریب' آپ کے سامنے وہ انسان ہیں اور جو انسان ہوتا ہے' وہ انسان ہوتا ہے۔"

"اس کے علاوہ بھی ایک حقیقت ہے جسے تم جانتے ہو۔ جب ہم باپ دادا سے ورثے میں بہت کچھ حاصل کرتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں تو پھر میں اس پر فخر کیوں نہ کروں کہ میرے ابو نے ایک چوکیدار کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ اگر ہم ایک اچھا اور نیک کام کرتے وقت دنیا والوں کے سامنے چھوٹے اور مضحکہ خیز بن جاتے ہیں اور ہمیں ایسا کرتے ہوئے شرم آتی ہے تو پھر ہم اپنے باپ دادا کی روایات سے انحراف کرتے ہیں۔ جس میں دنیا خوش ہو' ہم باپ دادا کے انہی اصولوں پر فخر کرتے ہیں اور جس اچھے عمل کو دنیا مضحکہ خیز کہتی ہے' ہم اس اچھے عمل سے کتراتے ہیں۔ اسی لیے ہماری انسانی تہذیبی روایات زوال کی طرف جا رہی ہیں۔"

"آپ درست کہتے ہیں۔ اچھے اعمال کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ دنیا ہنستی ہے تو ہنستی رہے۔"

"ابھی ذرا دیر پہلے میں نے تم سے سوال کیا تھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ زلیخا تم سے سچی محبت کرتی ہے۔ تم اس کے جواب میں کوئی عملی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟"

"وہ کیسے؟"

"تم اس سے کہو کہ وہ تمہارے ساتھ میری شادی میں شریک ہونے آئے۔ اسے میرا نام بتانا ضروری نہیں ہے صرف اتنا کہو کہ تمہارے مجھ سے کاروباری تعلقات ہیں اور تم کاروبار میں مجھ سے خاصا منافع حاصل کرتے ہو۔"

"کاروباری معاملات کی اہمیت معلوم ہو گی تو وہ میرے ساتھ ضرور آپ کی شادی میں آئے گی۔"

"وہ نہیں آئے گی۔"

قاضی نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا آپ میری وائف کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جتنا تم اسے جانتے ہو' اس سے کچھ اور زیادہ جان لو۔ اس سے صرف اتنا کہو کہ تمہارا یہ کاروباری دوست ایک چوکیدار کی بیٹی سے شادی کر رہا ہے۔ بارات چوکیدار کے اس گھر میں جائے گی جس کی چھت گھاس پھوس کی ہے اور دیواریں بانسوں اور کھپچیوں سے بنائی گئی ہیں۔"

قاضی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بڑی آن بان اور شان والی تھی۔ دوسروں سے ذرا اونچی رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ مسجد کمیٹی کے دین دار ممبران اور مولوی حضرات اس سے ملنے آتے تھے تو وہ سب فرش پر بیٹھتے تھے اور وہ ایک صوفے پر شاہانہ انداز میں بیٹھ کر گفتگو کرتی تھی۔ علاقے کے کسی بزرگ کو بھی اس کے برابر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔

اب شہید مرزا کی شادی میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ قاضی ذرا اُلجھ ہوئے سوچنے لگا کہ زلیخا ایسی شادی میں شریک ہونا اپنے سماجی مرتبے کے خلاف سمجھے گی لیکن وہ اسے کاروباری تعلقات اور کثیر منافع حاصل کرنے کا حوالہ دے کر اسے منائے اور شاید وہ مان جائے گی۔

شہید مرزا نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر کہا۔ "تم تو ابھی سے پریشان نظر آرہے ہو میں چاہتا ہوں کہ تم خود اپنے اس دعوے کی تصدیق کر لو کہ وہ تم سے سچی محبت کرتی ہے۔ اگر کرتی ہے تو اپنے سرتاج کے ساتھ ہر چھوٹے بڑے گھر میں جائے گی اور اگر جانے کے سلسلے میں صاف انکار کرے تو تم ایک بھولا ہوا سبق یاد کر لینا کہ تم ایک چوکیدار کے بیٹے ہو۔ ایسے انکشاف کے بعد سچی محبت کا عالم کیا ہو گا؟"

قاضی بعض افراد کی طرح یا تو اپنی اوقات بھول گیا تھا پھر یہ خوش فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ زلیخا کو حاصل کر لینے اور اسے اپنے بچے کی ماں بنانے کے بعد اس کی پوری دنیا

س کے دل و دماغ پر مسلط ہو گیا ہے۔ ویسے دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ ایک شخص دوسرے خص کو پوری طرح اپنے قابو میں کر لے' اس کی تمام محبت اور توجہ اپنے نام کر لے پھر بھی اس کے خاندانی نظریات اور عقائد بدل نہیں پاتا۔

اس نے پھول باڑی کی حویلی میں آکر زلیخا کو دس ہزار روپے دیئے پھر کہا۔ "یہ میں نے مختلف مہاجنوں سے مسجد کے لیے حاصل کیے ہیں۔ ابھی اور بہت سی کاروباری پارٹیاں ہیں۔ ان سے بھی آئندہ پندرہ بیس ہزار روپے تک وصول ہو جائیں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "یہ تو کمال ہو گیا کہ اتنی بڑی رقم مل گئی اور آئندہ بھی ملے گی۔ اچھا یہ بتائیں' اس میں ہمارا نام ہو گا نا؟"

"ہاں' میں کل صبح مسجد کمیٹی والوں کو اور دوسرے بزرگوں کو بلاؤں گا اور انہیں یہ رقم دکھا کر کہوں گا کہ یہ ان کی پھول باڑی کی مالکن زلیخا بیگم نے دی ہے۔ چند ماہ یا سال بھر میں مزید پندرہ بیس ہزار دیں گی۔"

وہ خوشی سے لپٹ گئی پھر بولی۔ "صرف پھول باڑی میں نہیں بلکہ آس پاس کے زمینداروں تک یہ خبر پہنچے گی تو وہ سب کے سب ہماری دولت مندی اور شان شوکت سے مرعوب ہو جائیں گے۔"

زلیخا نے نوٹوں کی وہ گڈی اپنے صندوق میں رکھ دی۔ ڈھاکا میں اس کا بینک اکاؤنٹ تھا۔ وہ بڑی بڑی رقمیں وہیں جمع کرتی تھی' دوسرے دن مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں اتنی بڑی رقم دینے کا اعلان کرنے کے بعد وہ دس ہزار روپے ڈھاکا لے جا کر بینک میں جمع کرنے والی تھی۔

قاضی نے اسے اس قدر خوش ہوتے دیکھا تو کہا۔ "اس جمعے کو ایک بزنس مین کی شادی ہے۔ مجھے اس کے ذریعے اپنے کاروبار میں اچھا خاصا منافع حاصل ہوتا ہے۔ ہم دونوں کو اس کی شادی میں شریک ہونا چاہیے۔"

"جو بھی بزنس مین ہمیں چھوٹا بڑا منافع پہنچاتا ہے' ہمیں ان سب سے دوستانہ روابط رکھنے چاہئیں۔ ہم ضرور چلیں گے۔"

"وہ ایک کروڑ پتی بزنس مین ہے لیکن ہمیں اس کی بارات میں شامل ہو کر ایک جھونپڑی میں جانا ہو گا۔"

"جھونپڑی میں کیوں؟"

"وہ بے انتہا دولت مند شخص ایک چوکیدار کی بیٹی سے شادی کر رہا ہے۔"

زلیخا کے منہ میں جیسے کوئی کڑوی چیز آ گئی ہو۔ اس نے منہ بنا کر حقارت سے پ

"چوکیدار کی بیٹی! کیا وہ اپنے بزنس کی وجہ سے دولت مند بن گیا ہے؟ کیا وہ بھی گزرے خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟"

"نہیں۔ وہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان چھوٹا بڑا نہ ہوتا۔ اگر کوئی ہم سے سماجی حیثیت میں نیچے ہو اور ہم جھک کر اسے تھام کر اٹھا لیں ت بھی ہمارے برابر ہو جائے گا۔"

"وہ بکواس کرتا ہے۔ میں اپنے بزرگوں کے اصولوں پر چلتی ہوں۔ میرے بابا تھے کہ کوئی خاک پر پڑا ہو تو اسے جھک کر نہ اٹھاؤ کیونکہ جھکنے سے توازن بگڑے گا تو بھی نیچے گر جائیں گے۔ یا جس کا ہاتھ پکڑ رہے ہوں' وہی ہمیں اپنی طرف پستی سے لے تو ہمارے پیروں تلے سے بلندی نکل جائے گی۔"

پھر وہ ایک صوفے پر شاہانہ انداز میں بیٹھ کر دونوں ہاتھوں صوفے کے دو ہتھوں پر رکھ کر بولی۔ "سوری' میں نہیں جاؤں گی' آپ چلے جائیں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو۔ شادی پر ہم دونوں کو بلایا گیا ہے۔"

"شادی میں نہیں' ایک چوکیدار کی جھونپڑی میں بلایا گیا ہے۔ محل سے جھو میں اور صوفے سے چٹائی پر بٹھانے کی انسلٹ کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ اگر وہ کرو کسی غریب تھرڈ کلاس لڑکی سے شادی کر رہا ہے تو پھر وہ نارمل نہیں ہے۔ مگر میں تو نا ہوں۔ ایک موٹی سی عقل سے سمجھ سکتی ہوں کہ یہاں سے پرفیوم اسپرے کر کے جاؤں تو گٹر کی بدبو میرے بدن اور لباس کی خوشبو کو فنا کر دے گی۔"

وہ عاجزی سے بولا۔ "جولی! ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ سونے کو لاکھ مٹی میں جائے وہ پھر بھی سونا ہی رہتا ہے اور تم تو جگمگاتا ہوا ہیرا ہو۔"

"میں مٹی میں ملنے والا ہیرا نہیں ہوں۔ آپ کے اس سے کاروباری تعلقات ہ آپ اس کی شادی میں جائیں۔ میری اس سے کوئی رشتے داری نہیں ہے اور نہ ہی ا نامعقول لوگوں سے رشتے داری ہو سکتی ہے۔"

قاضی کا سر جھک گیا۔ شہید مرزا نے کہا تھا کہ زلیخا کے پیار کی سچائی کا دعویٰ کر ہو تو وہ بھولا ہوا سبق بھی یاد کر لینا کہ تم چوکیدار کے بیٹے ہو۔

وہ بڑی شرمندگی سے مرزا کی شادی میں شریک ہونے آیا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا ب سے رومال نکالو اور چہرے سے شرمندگی پونچھ ڈالو۔ یہ مان لو کہ میں تمہاری وائف م سے زیادہ پہچانتا ہوں۔"

یہ قاضی کے لیے اور زیادہ شرم کی بات تھی کہ مرزا اس کی زلیخا کو اس سے زیادہ ا ہے اور یہ بات دل کو بری بھی لگی کیونکہ زلیخا لاکھ مغرور سہی آخر اس کی بیوی ۔ گھر کی عزت اور اس کے بچے کی ماں بھی تھی۔ اس کے ساتھ اتنے گہرے رشتے بتنے مرزا سے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ درست ہے کہ وہ چوکیدار کا بیٹا تھا مگر اب پھول باڑی کی مالکن زلیخا کے سر کا تھا اور سر کے تاج کو کوئی پیروں تلے نہیں لاتا۔ ویسے یہ دانش مندی ضروری تھی کہ تک زلیخا سے اس کی اصلیت چھپی رہے بہتر ہے۔ یہ اندیشہ تو تھا کہ کسی دن سچائی ہو گی' وہ اس دن سے ڈرتا تھا۔

ڈرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اس کی بے عزتی کرے گی یا اسے پھانسی پر چڑھا گی۔ وجہ یہ تھی کہ بندہ منشیات کا عادی ہو جائے تو اسے چھوڑ نہیں پاتا۔ اگر وہ ۔ جائے تو اس کے لیے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتا ہے' قاضی بھی زلیخا کا عادی ہو گیا س کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے ناز نخرے اٹھاتے اٹھاتے اس کا تابعدار بن گیا ب تو زندگی جیسے بھی گزرتی اسے گزارنی تھی۔ ویسے شہید مرزا چوکیدار کی بیٹی سلمیٰ اتھ بڑے اطمینان سے زندگی گزار رہا تھا کیونکہ وہ نہ کسی کا محتاج تھا اور نہ ہی کسی ، بات چھپائی تھی کہ اس کی شریک حیات ایک جھونپڑی سے آئی ہے۔ اونچی ٹی میں پہلے اس کے پیٹھ پیچھے اسے تضحیک کا نشانہ بنایا گیا لیکن وہ بڑے کاروباریوں ست میں تھا۔ اس سے تعلق ختم نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے اُس کے ساتھ کاروبار کے لیے بڑے لوگ اس کی بیوی سلمیٰ کو تحائف لا کر دیتے تھے تاکہ آئندہ تعلقات رہیں۔

اس کے برعکس قاضی امجد اندیشوں میں گھرا رہتا تھا۔ شادی کے تیسرے برس وہ ر بچے کا باپ بن گیا تھا۔ اس بار بیٹی ہوئی تھی۔ شہید مرزا نے پھر اسے باپ بننے پر باد دی پھر کہا۔ "تم نے پھول باڑی کی مسجد کے لیے پچیس ہزار روپے دینے کا یا تو اپنے وقت تم شہید مرزا تھے کیونکہ تم میرا بریف کیس وہاں لے جاتے ہو تو

زلیخا اس بریف کیس میں کاروباری کاغذات اور بینک وغیرہ کی چیک بکس وغیرہ دیکھ کر
سمجھتی ہے کہ تم نے ایک بڑے بزنس مین شہید مرزا کی حیثیت سے مسجد کی تعمیر کا وعدہ
ہے۔ تمہارے دل میں بھی یہی اعتماد تھا کہ میں مسجد کے سلسلے میں اتنی رقم دے
ہوں۔ لہٰذا یہ پندرہ ہزار لو اور اپنا وعدہ پورا کرو۔"

قاضی نے وہ رقم لے جا کر زلیخا کو دی۔ دوسرے دن پھول باڑی سے باہر دور
کے زمینداروں تک یہ شہرت پہنچ گئی کہ مالکن زلیخا بی بی نے مسجد کی تعمیر کے لیے
پندرہ ہزار روپے دیئے ہیں۔ آئندہ اس کے بعد جو بڑی رقم آئے گی تو مسجد کی تعمیر کا
شروع کر دیا جائے گا۔

قاضی نے کہا۔ "جولی! تم دیکھ رہی ہو۔ تمہاری شہرت کا یہ عالم ہے کہ آئندہ ا
کے لیے دو بڑی سیاسی پارٹیاں تمہیں ٹکٹ دینے کے لیے تیار ہیں۔"

"میرے بابا نے کہا تھا' کبھی سیاست میں حصہ نہ لینا۔ ویسے میں اپنے علاقے کے
ہزار ووٹ اس پارٹی کو دوں گی جو برسرِ اقتدار آکر سرکاری ریکارڈ میں میرے بابا کو شہ
درجہ دینے کا معاہدہ کرے گی۔"

دودھ آخر دودھ ہی ہوتا ہے لیکن اس میں پانی مل جائے تو لاکھ اسے دودھ کہ
صرف نام کا دودھ رہ جاتا ہے۔ اسی طرح حبیب الرحمان کی شہادت میں ملاوٹ تھی
خالص شہید نہیں تھا۔ جو سیاسی پارٹی کامیاب ہوتی ہے اور اپنی حکومت بناتی ہے
دراصل کوالٹی کنٹرولر ہوتی ہے اور فیصلہ سناتی ہے کہ کون خالص شہید ہے اور کون
موت مر کر حالات کے سیاق و سباق سے شہید کہلا رہا ہے۔

زلیخا نے وہ پندرہ ہزار روپے بھی بینک میں جمع کر دیئے تھے۔ اس طرح مسج
حساب میں پچیس ہزار روپے زلیخا نے دیئے تھے اور پہلے کے تین ہزار روپے کچھ
قاضی نے مزید پونے دو ہزار دے کر مسجد کے لیے تیس ہزار روپے کی رقم پوری ک
تھی۔ اس نے زلیخا سے کہا۔ "یہ میری اور تمہاری آپس کی بات ہے' وہ پچیس ہزار
نہیں دیئے ہیں وہ دوسرے کی رقم ہے مگر نام تمہارا ہو رہا ہے۔ اتنی بڑی رقم کو ا
سے جائز کرنے کے لیے تم اپنی طرف سے پانچ ہزار روپے دے دو۔"

"میں گھاٹے کا سودا نہیں کرتی ہوں۔ جب مجھے پچیس ہزار دینے کی شہرت م
ہے تو پانچ ہزار دینے کی حماقت کیوں کروں؟"

"یوں سمجھ لو کہ پچیس ہزار خالص ہیں اور تم پانچ ہزار دے کر ملاوٹ کر رہی ہو۔ جب ہر جگہ پانی ملا ہوا دودھ قابلِ قبول ہوتا ہے تو تمہارے تیس ہزار بھی قابلِ قبول ہوں گے۔ ضمیر بھی مطمئن رہے گا۔"

"میں آج تمہیں بتانے والی تھی کہ فش ہاربر کے لیے میں نے حکومت کو جو درخواست دی تھی' وہ منظور ہو چکی ہے۔ ایک بڑا بجلی گھر اور فش ہاربر کے لیے تین لاکھ روپے منظور ہو چکے ہیں۔ اس اسکیم کے لیے تین لاکھ کم ہیں۔ باقی جتنی رقم کی ضرورت ہو گی اسے میں اپنے اکاؤنٹ سے پورا کروں گی۔ میں تو کہتی ہوں' مسجد کی تعمیر ابھی شروع نہ کی جائے۔ پہلے میری اسکیم پر کام شروع ہو جائے۔ اگر رقم کم پڑے گی تو ہم مسجد کے یہ تیس ہزار روپے اس اسکیم پر لگا سکیں گے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ بے چارے نمازی حکومتِ برطانیہ کے زمانے سے پکی چھت اور پکی دیواروں والی مسجد کا خواب دیکھ رہے ہیں اور تم امانت میں خیانت کرنا چاہتی ہو۔"

وہ بولی۔ "میری نیت میں بے ایمانی نہیں ہے۔ میں پورے علاقے کی بھلائی کے لیے اتنی بڑی اسکیم شروع کرنے والی ہوں۔ اس سے جو منافع حاصل ہو گا اس میں سے مسجد کی رقم واپس کر دوں گی۔ یہاں کے لوگ صدیوں سے ٹین کی چھت اور بانسوں کی دیواروں میں نمازیں پڑھتے جا رہے ہیں۔ دو چار برس اور اسی طرح گزارہ کر لیں گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔"

وہ زلیخا سے زیادہ بحث نہیں کرتا تھا۔ کوئی بات اس کے مزاج کے خلاف ہو تو وہ ناراض ہو جاتی تھی پھر اسے منانے میں کئی دن لگ جاتے تھے۔ اس لیے وہ بحث میں اس سے ہار مان جاتا تھا۔

بعض جھوٹ اور فریب ایسے ہوتے ہیں جو فوراً ظاہر ہو جاتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو ڈھکے چھپے رہتے ہیں اور برسوں گزر جانے کے بعد اچانک توقع کے خلاف ظاہر ہو جاتے ہیں۔ پانچ برس میں قاضی تیسرے بچے کا باپ بن گیا۔ اس بار بیٹا ہوا تھا۔ چار ماہ بعد ایک بہت بڑے گھرانے میں شادی ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے سرمایہ دار اور ان کی بیگمات شریک ہو رہی تھیں اور دلہن کے لیے قیمتی تحائف دے رہی تھیں۔ ایسی جگہ زلیخا نے صرف ایک ہزار روپے پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک عمر رسیدہ خاتون دلہن کا منہ

دکھا کر کہتی جا رہی تھی کہ فلاں صاحب کی بیگم نے فلاں تحفہ دیا ہے۔ ایسے وقت میں خاتون نے زیورات کا ایک سیٹ تمام خواتین کو دکھا کر کہا۔ "یہ مرزا جُوٹ مل تیج گاؤں کے مالک شہید مرزا کی بیگم سلمٰی نے دیا ہے اور یہ دس ہزار روپے کا سونے کا سیٹ ہے۔"

زلیخا کے ذہن کو جیسے جھٹکا سا پہنچا۔ مرزا جوٹ مل تیج گاؤں کا مالک تو اس کی دانست میں قاضی امجد تھا۔ اگرچہ مل کا کاروبار شہید مرزا کے نام سے چلتا تھا لیکن دس ہزار کا سونے کا سیٹ دکھانے والی خاتون شہید مرزا کی بیگم کا نام سلمٰی بتا رہی تھی۔ جبکہ قاضی امجد عرف شہید مرزا کی بیگم کا نام زلیخا تھا۔ پھر اس زلیخا نے دس ہزار روپے کا سیٹ پیش نہیں کیا وہ تو ایک لفافے میں ایک ہزار روپے رکھ کر دینے والی تھی۔

اب وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ایک بڑے جوٹ مل کے مالک کی بیگم وہ خود کو سمجھ رہی تھی لیکن اس سے پہلے اس مل کے مالک کی بیوی کا نام سلمٰی بیگم بتایا گیا تھا۔ وہ اس سلمٰی کو دیکھے اور سمجھے بغیر بڑی بڑی بیگمات کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ شہید مرزا کی بیگم کا نام غلط لیا جا رہا ہے۔

اس نے ایک خاتون سے پوچھا۔ "یہاں سلمٰی بیگم کون ہیں؟"

اس خاتون نے سلمٰی سے اس کا تعارف کرایا۔ وہ مصافحہ کر کے بولی۔ "میرا نام بیگم سلمٰی مرزا ہے۔ اور آپ کی تعریف؟"

"میں بیگم زلیخا قاضی ہوں۔ ویسے تو میرے میاں قاضی امجد کے نام سے پہچانے جاتے ہیں لیکن ان کا دوسرا نام شہید مرزا ہے۔ وہ اسی نام سے کاروبار کرتے ہیں۔ تیج گاؤں میں ان کی بھی جُوٹ مل ہے۔"

سلمٰی نے مسکرا کر پوچھا "کون سی جوٹ مل ہے؟"

زلیخا اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کا نام بھی مرزا جوٹ مل ہے۔ ایک ہی علاقے میں ایک ہی نام کی دو ملیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس نے بات بنائی۔ "میرے میاں بڑے سخت مزاج کے آدمی ہیں۔ وہ اپنے کاروبار کے متعلق کچھ بتاتے نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب سے میں بیاہ کر آئی ہوں انہیں کاروبار میں نقصان پہنچ رہا ہے۔"

"شاید وہ اپنی سخت مزاجی کے باعث نقصان اٹھاتے ہیں۔ میرے میاں بڑا ٹھنڈا مزاج رکھتے ہیں۔ اگر آپ کے میاں ایک بار ان سے مل لیں تو.........." سلمٰی بیگم کہتے

کہتے رک گئیں۔ پھر جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے بولیں۔ "ابھی آپ نے اپنے میاں کا نام قاضی امجد بتایا تھا۔ تعجب ہے، ہمارے کاروبار کے جنرل مینجر کا نام بھی قاضی امجد ہے۔ میرے میاں تو ان پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ اپنا کاروباری حساب کتاب اور بینک کی چیک بکس وغیرہ انہی کے پاس رہنے دیتے ہیں۔"

زلیخا کا سر چکرانے لگا۔ وہ بارہا شہید مرزا کے نام کے کاروباری کاغذات وغیرہ اپنے شوہر قاضی امجد کے بریف کیس میں دیکھ چکی تھی۔ پھر یہ کہ شادی سے پہلے ایک بار کار میں بیٹھ کر مرزا جوٹ مل بھی جا چکی تھی۔ قاضی لاکھوں روپے شہید مرزا کے اکاؤنٹ میں جمع کرتا تھا۔ وہ فرمائش کرتی تھی کہ اس کے لیے ہیروں کے زیورات کا ایک سیٹ خریدے لیکن وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ ابھی جو شاپنگ پلازا تعمیر کیا جا رہا ہے اس میں لاکھوں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ جب یہ پروجیکٹ مکمل ہو جائے گا تو زلیخا کی بڑی سے بڑی خواہش پوری کر دے گا۔

وہ بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ آپ کے میاں کاروباری معاملے میں میرے میاں کو گائیڈ کریں۔ کیا مسٹر شہید مرزا سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

سلمٰی بیگم نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "آپ کچھ دیر پہلے کہتیں تو ملاقات ہو جاتی۔ اب تو ساڑھے چار بج رہے ہیں۔ وہ ٹھیک پانچ بجے ہر جمعرات کو شہید حبیب الرحمان کے شہید مینار پر فاتحہ پڑھنے جاتے ہیں۔"

زلیخا کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "وہ شہید مینار کیوں جاتے ہیں، کیا شہید حبیب الرحمان سے رشتے داری تھی؟"

"رشتے داری نہیں، کوئی تعلق ان سے تھا۔ میں اچھی طرح نہیں جانتی۔ ہاں یہ جانتی ہوں کہ انہوں نے اپنی زمین پر ان کا شہید مینار بنایا تھا۔"

وہ چکرا کر گرنے والی تھی لیکن پیچھے کرسی تھی، اس پر دھپ سے بیٹھ گئی۔ ایک شہید مرزا سلمٰی کا خاوند تھا جس نے اپنی زمین پر اس کے بابا کا شہید مینار بنایا تھا اور ایک شہید مرزا اس کا اپنا خاوند تھا جس کا نام قاضی امجد بھی تھا۔

وہ ایک دو منٹ تک خود کو سنبھالتی رہی اور سوچتی رہی پھر فوراً ہی اٹھ کر تیزی سے چلتی ہوئی باہر آئی۔ اس کے بابا کا شہید مینار وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ سائیکل رکشہ پر بیٹھ کر ادھر چل پڑی۔ اس کے دماغ میں یہ بات چکرا رہی تھی کہ ایک ہی زمین

کے دو مالک ہیں۔ دونوں کا نام شہید مرزا تھا اور دونوں کے متعلق یہ معلوم تھا کہ کسی ایک شہید مرزا نے اس کے بابا کا شہید مینار وہاں بنایا ہے۔

وہ اپنے بابا کے شہید مینار کے پاس رکشا سے اتر گئی۔ رکشا والا کرایہ لے کر چلا گیا۔ ایک منٹ کے اندر ایک نہایت ہی قیمتی کار آکر اس کے بالکل قریب رک گئی۔ اس میں وہ شہید مرزا بیٹھا ہوا تھا جو کبھی اس کے انتظار میں سڑک کے کنارے کھڑا رہتا تھا۔ زلیخا نے اسے حیرانی اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ مسکراتا ہوا کار سے باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کا ایک سرخ پھول تھا۔ وہ گلاب جیسے گزرے ہوئے کل کو آج بنا رہا تھا۔

وہ اپنے ہاتھ میں پھول لئے اس کے سامنے سے گزرتا ہوا شہید مینار کے بالکل قریب آیا۔ وہ سمجھ رہی تھی شاید وہ ایک بار پھر اس کے لیے پھول لایا ہے لیکن جب وہ بے نیازی سے آگے بڑھ گیا تو اسے اپنی انسلٹ کا احساس ہوا پھر اس نے سوچا کہ شاید وہ گلاب کا پھول اس کے شہید بابا کے لیے لایا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پیچھے آئی۔ پھر ایک دم سے اس کے دماغ میں غصے سے گرمی بھر گئی۔ وہ گلاب کے ڈنٹھل کو پکڑے ہوئے تھا اور اس میں سے ایک ایک کانٹے کو توڑ کر ہر کانٹے کو ادھر اچھال رہا تھا جہاں اس کے بابا حبیب الرحمان کا نام کندہ کیا گیا تھا۔

ایک شہید کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس کے نام پر کانٹے پھینکے جا رہے تھے اور پھینکنے والے نے گلاب کے پھول کو بحفاظت اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا۔ وہ غصے سے بولی۔ "وھاٹ نان سینس۔ تم میرے بابا کے نام پر کانٹے اچھال رہے ہو۔"

وہ بولا۔ "جو شہید ہوتے ہیں وہ تاقیامت گلاب کی طرح عزم و حوصلے کی خوشبو پھیلاتے رہتے ہیں لیکن تم نے اسی گلاب پر تھوک کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ تمہارے بابا پر بھی تھوکتے رہنا چاہیے۔"

"یو شٹ اپ!" وہ حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے بولی۔ "تم میرے بابا پر تھوکنے کی بات کر رہے ہو۔ میں ابھی لوگوں کو جمع کر کے ان سے کہوں گی کہ تم ایک شہید کی توہین کر رہے ہو۔"

"لوگ جمع ہوں گے تو میں یہ پھول بڑے ادب سے شہید کے نام کے پاس رکھ دوں گا۔ تم کانٹوں پر اعتراض کرو گی تو لوگ کہیں گے کہ کانٹوں کے ساتھ پھول بھی ہوا کرتے

ہیں اور میں نے کانٹے اور پھول دونوں رکھے ہیں۔"

اس نے بے بسی سے اسے دیکھا اور سوچا۔ "واقعی وہ پھول کو بھی کانٹوں کے ساتھ رکھے گا تو میں ثابت نہیں کر سکوں گی کہ یہ میرے بابا کی انسلٹ کر رہا ہے۔"

وہ اسے گھور کر بولی۔ "تمہیں میرے بابا سے کیا دشمنی ہے؟"

"اور تمہیں مجھ سے محبت اور نفرت کیوں ہے؟ تم محبت سے شہید مرزا کے کاروبار کی مالکہ کہلانا چاہتی ہو اور دوسری طرف شہید مرزا سے نفرت کر کے بیگم قاضی امجد کہلا رہی ہو۔"

"تم قاضی امجد کو کیسے جانتے ہو؟"

"وہ میرا ملازم ہے۔ مگر میں تمہاری طرح ملازموں کو کتا اور کمینہ نہیں کہتا۔ انہیں انسان سمجھتا ہوں۔ تمہارا شوہر قاضی امجد میرا صرف ملازم ہی نہیں ایک وفادار دوست بھی ہے۔"

زلیخا کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ بڑی ضد اور حوصلے سے دونوں پیروں پر کھڑی ہوئی تھی۔ ضد یہ تھی کہ وہ خود کو ایک ملازم کی بیوی تسلیم نہیں کرے گی اور حوصلہ یہ تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے گی۔

اس نے بڑے صبر و ضبط سے پوچھا۔ "تمہیں میرے بابا سے کیا دشمنی تھی کہ اتنی لمبی انتقامی کارروائی کر رہے ہو؟"

"یہ معاملہ فقط اتنا سا ہے کہ تمہارا باپ مجھے ایک لاش بنا کر دریائے سیتالکھا میں نہ بہا سکا' میں نے اس کا شہید مینار یہاں بنوا دیا۔ میری اعلیٰ ظرفی دیکھو کہ تمہارے باپ کو مرنے کے بعد بھی عزت دے رہا ہوں۔ یہاں اس کے شہید مینار پر پھولوں کے ہار چڑھائے جاتے ہیں۔ یہ ایک گلاب کا پھول میرے ہاتھ میں بھی ہے۔ میں یہ پھول اس یادگار پر چڑھانا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ اس گلاب پر تھوک دو۔ میں اسے تمہارے باپ تک پہنچا دوں گا۔"

وہ تیزی سے پلٹ گئی۔ پھر اتنی ہی تیزی سے چلتی ہوئی سڑک کے کنارے جانے لگی۔ جب ایک خالی سائیکل رکشہ نظر آیا تو اس میں بیٹھ کر شادی والے گھر کے سامنے پہنچی۔ پرس سے پیسے نکال کر رکشے والے کو دینے لگی۔ اسی وقت قاضی امجد دوڑتا ہوا آیا پھر بولا۔ "مجھے ابھی پتا چلا کہ تم اپنی کار چھوڑ کر رکشے میں گئی ہو' کہاں گئی تھیں؟"

وہ بولی۔ "چابی تمہارے پاس تھی۔ جاؤ گاڑی یہاں لے آؤ۔ ہم ابھی پھول باڑی چل رہے ہیں۔"

"اتنی جلدی، پہلے دلہن کے ماں باپ سے الوداعی ملاقات تو کرلیں۔"

وہ غصہ ضبط کر رہی تھی۔ دانت پیس کر بولی۔ "کیری آن مائی آرڈر۔ جاؤ اور فوراً گاڑی لاؤ۔"

وہ اپنی بیوی کے مزاج کو پانچ برس سے سمجھتا آیا تھا اس لیے دوڑتا ہوا ادھر گیا جہاں بہت سی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی کار ڈرائیو کرتا ہوا زلیخا کے پاس آکر رک گیا۔ پھر وہ جلدی سے اتر کر اس کے لیے دوسری طرف کا اگلا دروازہ کھولنا چاہتا تھا اس سے پہلے ہی وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ دروازے کو زور دار آواز سے بند کرنے کے انداز میں غصہ تھا۔ وہ کار کی پچھلی کھڑکی پر جھک کر بولا۔ "یہ کیا کرتی ہو؟ ہم میاں بیوی کو آگے ایک ساتھ بیٹھنا چاہیے۔ یہاں دوست احباب تمہیں پچھلی سیٹ پر دیکھ کر کیا سوچیں گے؟"

"اپنی اوقات میں رہو۔ مجھے تم نہیں، آپ کہو۔ اگر تم نے فوراً گاڑی نہ چلائی تو میں سب کے سامنے تمہاری عزت اتار دوں گی۔"

قاضی کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ سر جھکائے اسٹیئرنگ سیٹ پر آیا پھر کار اسٹارٹ کر کے اسے ڈرائیو کرتا ہوا اس شادی والے گھر سے دور جانے لگا۔ پچھلی سیٹ پر گہری خاموشی تھی۔ وہ تیج گاؤں سے محمد پور والی سڑک پر آکر بولا۔ "تم بہت غصے میں ہو۔ کیا دلہن والوں کے ہاں کسی نے تمہارے مزاج کے خلاف بات کہہ دی ہے؟"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہی پھر بولی۔ "مرزا جوٹ مل کا مالک کون ہے؟ اگر سچ نہیں بولو گے تو ابھی گاڑی واپس موڑ کے اس مل میں چلو گے پھر میں وہاں اپنے طور پر معلومات حاصل کروں گی۔"

اب قاضی کو چپ سی لگ گئی۔ بڑی حد تک بات سمجھ میں آگئی۔ وہ ڈانٹ کر بولی۔ "میری بات کا جواب دو؟"

وہ شکست خوردہ سی آواز میں بولا۔ "مرزا جوٹ مل کا مالک شہید مرزا ہے۔"

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "شہید مرزا تو تم ہو۔"

"نہیں۔ وہ میرے محسن ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنے کاروبار میں صرف جنرل مینجر

کام ہی نہیں دیا بلکہ اپنا نام بھی دیا۔ مجھے شہید مرزا بنا دیا۔"

"تھو ہے تم پر۔ تم اس کے ساتھ مل کر مجھے پانچ برس سے دھوکا دیتے آرہے ہو۔"

"میں نے دھوکا نہیں دیا ہے۔ میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ ہم دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ تم جس سے شادی کرنا چاہو گی، وہی تمہارا جیون ساتھی بنے گا۔"

"میں تم دونوں کو خاک میں ملا دوں گی۔ کیا تم لوگوں نے مجھے لاٹری کا مال سمجھا تھا؟"

"ہمارے سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مرضی تو تمہاری تھی۔ تم نے اپنی مرضی سے مجھ سے شادی کی تھی۔"

"میں نے تمہیں شہید مرزا سمجھ کر شادی کی تھی۔"

"لیکن نکاح قاضی امجد سے قبول کیا تھا۔"

"بکواس مت کرو۔ تم دونوں نے مل کر مجھ سے فراڈ کیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ مجھ سے کیوں دشمنی کی گئی؟"

کار میرپور کے راستے سے گزر کر پھول باڑی کی طرف جا رہی تھی۔ قاضی اسے اس کے بابا حبیب الرحمان کے بارے میں بتانے لگا کہ کس طرح وہ شہید مرزا کی ماں کو بیوہ اور مالدار دیکھ کر شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ماں نے ضد کی تھی کہ تمہاری شادی شہید مرزا سے کر دی جائے لیکن تمہارے بابا کو یہ منظور نہیں تھا کیونکہ مرزا کا باپ تو خاندانی تھا لیکن ماں ایک چوکیدار کی بیٹی تھی اور تمہارے بابا ایک چوکیدار کے نواسے کو داماد بنانا نہیں چاہتے تھے۔"

"میرے بابا نے درست فیصلہ کیا تھا۔ ہم اعلیٰ خاندان کے لوگ ہیں۔ برٹش گورنمنٹ نے میرے دادا کو زمینیں دی تھیں اور خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ میرے بابا پاگل نہیں تھے کہ ایک چوکیدار کے نواسے کو داماد بنا لیتے۔"

"وہ پاگل نہیں تھے پھر انہوں نے شہید مرزا کی والدہ مرحومہ سے شادی کیوں کی تھی جبکہ وہ چوکیدار کی بیٹی تھی؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ بیوہ کی تمام دولت اور جائداد پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔"

"میں نہیں مانتی کہ بابا نے مال و دولت کے لالچ میں چھوٹی ذات کو منہ لگایا ہوگا۔"

"ہر بیٹی کی نظروں میں اس کا باپ فرشتہ ہوتا ہے لیکن شہید مرزا کے پاس وہ نکاح

نامہ موجود ہے جس کی رُو سے تمہارے بابا نے اس چھوٹی ذات کی مالدار بیوہ سے شادی کی تھی۔"

"کی ہو گی۔ وہ رحم دل تھے۔ ایک بیوہ پر ترس کھایا ہو گا۔ انہوں نے شادی کی لیکن مجھے کیوں دھوکا دیا؟"

"ابھی میں نے کہا ہے کہ وہ ایک چوکیدار کے نواسے کو داماد نہیں بنانا چاہتے تھے تمہارے بابا کی یہ کیسی رحم دلی تھی! یہ رحم دلی چوکیدار کی بیٹی سے ہوئی لیکن چوکیدار کے نواسے سے نہیں ہوئی؟ وہ نواسا شہید مرزا تمہارے بابا کی نظروں میں کھٹک رہا تھا۔ انہوں نے سوچا' اگر وہ کسی حادثے میں مارا جائے تو اس بیوہ کی تمام دولت اور جائداد کی مالکہ بن جاؤ گی کیونکہ تم ہی ان کی واحد اولاد رہ جاؤ گی۔"

"کیا تم میرے بابا پر یہ الزام لگا رہے ہو کہ میرے بابا شہید مرزا کو قتل کرنا چاہتے تھے؟"

"یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔ تم اسے تسلیم نہیں کرو گی۔ شہید مرزا اپنی حکمت عملی سے زندہ سلامت رہ گیا لیکن سانپ کو زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس لیے پلٹن میدان کے جلسے میں اس نے تمہارے بابا کو قتل کرا دیا۔"

"نہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر روتے ہوئے بولی۔ "میرے بابا ذاتی دشمنی سے قتل نہیں ہوئے تھے۔ وہ بنگلہ بھاشا کو قومی زبان بنانے کی جدوجہد کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔"

"انہیں شہادت کا درجہ بھی شہید مرزا کی حکمتِ عملی سے ملا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے شادی کرو گی تو اس کے گھر ایک شہید کی باوقار بیٹی بن کر آؤ گی لیکن تم نے اسے ٹھکرا دیا۔ تم میں وہی اپنے باپ جیسا اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والا تکبر تھا۔ تمہارا باپ چوکیدار کے نواسے کو داماد نہیں بنانا چاہتا تھا۔ شہید مرزا نے تمہیں ایک چوکیدار کے بیٹے کی شریکِ حیات بنا دیا۔"

"کیا؟" زلیخا نے چونک کر پوچھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ ابھی جو آخری فقرہ سنا ہے وہ درست سنا ہے۔ سننے میں غلطی بھی ہو سکتی تھی۔

قاضی نے کار کو سڑک کے کنارے روکا پھر اس کی طرف گھوم کر کہا۔ "شہید مرزا کے والدین نے میرے تعلیمی اخراجات برداشت کیے۔ مجھے ایم اے پاس کرایا۔ شہید مرزا

نے مجھے جنرل مینجر بنایا۔ اس کے بعد تمہارا شوہر بنا دیا۔ اگر اس کے اتنے احسانات نہ ہوتے تو میں ایک چوکیدار کا بیٹا ہی رہتا۔"

وہ شدید حیرانی اور بے یقینی سے بولی۔ "تم.......... تم' کیا سچ کہہ رہے ہو؟ کیا کسی چوکیدار کے بیٹے ہو؟"

"ہاں۔ اسکول سے کالج تک تمام داخلے کے فارموں میں میری ولدیت اور والدہ کا پیشہ لکھا ہوا ہے۔"

"نہیں!" اس پر غصے کے مارے جنون سوار ہو گیا۔ یہ قطعی ناقابلِ برداشت تھا کہ ایک چوکیدار کا بیٹا اس اعلیٰ خاندانی لندن ریٹرن حسن و شباب کو حاصل کرتا آیا ہے۔ وہ اسے گالیاں دیتے ہوئے اس کا منہ نوچنے کے لیے اگلی سیٹ کی طرف جھکی۔ قاضی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے پھر کہا۔ "شور مچاؤ گی تو ایک مرحوم چوکیدار کی بہو کہلاؤ گی۔ خاموش رہو گی تو عزت بنی رہے گی۔"

اس نے یہ کہہ کر اسے دوبارہ پچھلی سیٹ کی طرف دھکیل دیا۔ اس نے سیٹ پر گر کر منہ چھپا لیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔ اگرچہ غصے اور توہین کے احساس سے دماغ پھٹا جا رہا تھا مگر یہ بات اہم تھی کہ وہ شور مچائے گی یا لڑائی کرے گی تو ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ پانچ برس سے ایک چوکیدار کے بیٹے کی بیوی بن کر رہتی آئی ہے۔

وہ تمام راستے روتی رہی اور غصے سے پیچ و تاب کھاتی رہی کہ ایک چھوٹی ذات کا آدمی اس کے حسن و شباب کا کباڑا کرتا رہا۔ اب وہ ایسے کم ذات کی بیوی بن کر رہنا نہیں چاہتی تھی مگر کیا کر سکتی تھی؟ کیا اس سے طلاق لے لیتی؟ کیا اسے اپنے اعلیٰ خاندان سے دھکے دے کر نکال سکتی تھی؟

وہ حویلی پہنچ کر اپنے کمرے میں آئی۔ ایک گود کے بچے کو آیا نے سنبھال رکھا تھا۔ دو چھوٹے بچے اپنی ماں کو دیکھ کر اس کے پاس آئے۔ اس نے سب کو دھتکار دیا۔ آیا سے کہا کہ تینوں کو باہر لے جائے پھر اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا تاکہ وہ کم ذات شوہر کی حیثیت سے اندر نہ آئے۔

قاضی اس کے پاس نہیں آیا۔ اسے رونے اور دل کا غبار نکالنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ آدھی رات کے بعد وہ پانی پینے کے لیے کمرے سے نکلی تو قاضی کچھ فاصلے پر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ بولا۔ "دروازہ بند کرنے سے پہلے ایک بات سن

لو۔ علیحدگی چاہتی ہو تو طلاق دے دوں گا لیکن اپنے بچوں کو لے جاؤں گا۔ تمہیں صرف ایک بیوی کی حیثیت سے نہیں' ایک ماں بن کر بھی سوچنا ہے۔"

وہ اس سے کترا کر چلی گئی۔ پھر پانی پی کر آئی تو قاضی نے کہا۔ "ابھی یہ کوئی نہیں جانتا کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ اگر لوگ جان لیں گے تو تمہارے تینوں بچے بھی چوکیدار کے بیٹے کی اولاد کہلائیں گے۔"

وہ اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔ اس کے قدم رک گئے۔ وہ ایک ماں بھی تھی' اپنے تینوں بچوں کو بھرپور ممتا دیتی تھی۔ ان بچوں کا مستقبل شاندار بنانے کے لیے وہ اپنے علاقے میں ایک بڑا بجلی گھر اور فش ہاربر بنوانے والی تھی۔ حکومت سے تین لاکھ روپے کا قرضہ منظور ہو گیا تھا۔ اگلے ہفتے تک قرضے کی پہلی قسط ملنے والی تھی۔ یہ سب کچھ وہ اپنی نیک نامی اور بچوں کی خوشحالی کے لیے کر رہی تھی۔ اگر قاضی امجد اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جاتا تو کوئی فرق نہ پڑتا لیکن اپنے جنم دیئے ہوئے بچوں کو وہ چھوڑ نہیں سکتی تھی اور نہ ہی یہ گوارا کر سکتی تھی کہ وہ تینوں چوکیدار کے بیٹے کی اولاد کہلائیں۔ وہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر بولی۔ "پلیز مجھے تنہا چھوڑ دو اور سوچنے سمجھنے کا موقع دو۔"

اس نے پھر دروازے کو بند کر لیا۔ وہ دروازہ دوسرے دن دس بجے تک بند رہا۔ پھر اس نے باہر نکل کر غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ پھر قاضی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی۔ بچوں کو پیار کرنے لگی۔ قاضی نے کہا۔ "مجھے یقین تھا کہ تم ذہانت سے بگڑی ہوئی بات بنا لو گی۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہمارا جو راز ہے' وہ ہم دونوں تک رہے گا۔ کسی تیسرے کو معلوم نہیں ہو گا۔ ہم نئے سرے سے ایک خوش گوار زندگی گزاریں گے۔ تم یقین کرو کہ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں نے بھی تمام رات یہی سوچا ہے۔ آپ کی محبت اور بچوں کے مستقبل کو سمجھا ہے۔ آپ سے صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرے احساسِ برتری کو ٹھیس نہ پہنچے لیکن شہید مرزا دشمن ہے۔ وہ مجھے نیچا دکھائے گا۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ ایک سچا اور کھرا انسان ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ تمہارے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالے گا۔ تم میری عزت ہو اور وہ مجھے اتنی عزت دیتا ہے کہ تم کبھی سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

"ویسے بھی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شہر کی طرف نہیں جاؤں گی۔ اپنے علاقے کی

ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت یہیں صرف کروں گی۔ مجھے حکومت سے قرضے کی پہلی قسط ملنے والی ہے۔ ہماری خوش حال زندگی کے ساتھ اس علاقے کی بھی خوش حالی شروع ہونے والی ہے۔ میں چاہتی ہوں' ایسی خوشی کا کام اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کیا جائے۔"

"بے شک۔ تم نہایت ہی مثبت انداز میں سوچ رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کئے ہوئے پروجیکٹ میں کامیابی ضرور ہو گی۔"

"پروجیکٹ کا کام شروع ہونے میں کم از کم ایک ماہ کا عرصہ لگے گا۔ میں چاہتی ہوں' اس سے پہلے مسجد کی تعمیر شروع ہو جائے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "دیکھو مثبت انداز میں سوچنے سے کیسے مثبت عزائم پیدا ہوتے ہیں۔ تم اللہ اور بندوں دونوں کو خوش کرنے والا کام پہلے کرنا چاہتی ہو۔ میں ابھی ملازموں سے کہتا ہوں کہ وہ مسجد کمیٹی والوں اور مولوی حضرات کو بلا کر لے آئیں۔"

دوپہر کو ظہر کی نماز کے بعد حویلی میں تمام مطلوبہ افراد جمع ہوئے۔ قاضی نے انہیں خوش خبری سنائی کہ مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہونے والا ہے۔ زلیخا نے کہا۔ "شروع ہونے والا نہیں بلکہ شروع ہو چکا ہے۔ کل جمعے کا مبارک دن ہے۔ نمازِ جمعہ کے بعد مسجد کی بنیاد رکھ دی جائے گی۔ مسجد کمیٹی کے کچھ رکن آج ہی شہر جائیں اور سیمنٹ' بجری اور سریا وغیرہ خرید کر لے آئیں۔"

قاضی نے کہا۔ "مسجد کی تمام رقم بینک میں ہے۔ ابھی بینک بند ہو چکا ہو گا' کل جمعے کی چھٹی ہے۔ یہ کام تو پرسوں ہو سکتا ہے۔"

"میں چاہتی ہوں' جمعے کے مبارک دن کام ہو۔ میرے پاس ابھی آٹھ ہزار روپے ہیں۔ یہ مسجد کمیٹی کے حضرات لے جائیں اور ایسے انتظامات کریں کہ کل سے ہی کام شروع ہو جائے۔"

وہ اٹھ کر حویلی کے اندرونی حصے میں گئی پھر آٹھ ہزار روپے لا کر مسجد کمیٹی کے صدر کو دے دیئے۔ اس کے بعد کہا۔ "پرسوں ہفتے کو قاضی صاحب مجھ سے چیک لے کر جائیں گے اور مسجد کے تیس ہزار روپے بینک سے نکال کر لے آئیں گے۔ ہماری کوشش یہی ہو گی کہ مسجد کا کام شروع ہونے کے بعد رکنے نہ پائے۔"

وہ ایسے ایمانی حوصلے اور ارادے سے کہہ رہی تھی کہ سب ہی کے اندر نئے سرے

سے ایمانی جذبے پیدا ہو رہے تھے۔ سب اسے دعائیں دے رہے تھے۔ مسجد کمیٹی کے رکن اور مولوی حضرات حویلی سے نکلتے ہی مسجد کی تعمیر شروع کرنے کے سلسلے میں مصروف ہو گئے۔ دوسرے دن نمازِ جمعہ کے بعد مسجد کی بنیاد کی کھدائی اور ابتدائی کام شروع ہو گیا۔ اس علاقے میں ترقی اور خوشحالی بھی آنے والی تھی اور ایمانی جذبوں سے کام کرنے والے مزدور صرف تین وقت کے کھانے کے عوض کام کرنے لگے تھے۔

ہفتے کی صبح پانچ بجے قاضی امجد زلیخا کا چیک لے کر جانے لگا تو مسجد کمیٹی کے تمام ارکان اسے رخصت کرنے آئے۔ وہ کار میں بیٹھ کر بولا۔ "میں شام کو پانچ بجے تک واپس آجاؤں گا۔" قاضی اور زلیخا نے محبت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر قاضی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اس نے شہر پہنچ کر شہید مرزا سے ملاقات کی۔ اس کے ساتھ بینک جاتے ہوئے زلیخا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ مرزا نے کہا۔ "وہ انتقامی کارروائی بھی کر سکتی تھی لیکن اسے اپنے بچوں کا زیادہ خیال ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ تمہاری اصلیت ظاہر ہو اور آئندہ اس کا پورا خاندان ایک چوکیدار کے حوالے سے پہچانا جائے۔ وہ اپنے بچوں کو ہمیشہ افضل اور برتر دیکھنا چاہتی ہے اس لیے اس نے نیکی کا یہ راستہ اختیار کیا ہے۔"

وہ دن کے گیارہ بجے ہی بینک سے تیس ہزار روپے نکال کر شہید مرزا سے رخصت ہو گیا۔ مرزا نے کہا۔ "آج میں بہت مصروف ہوں۔ کل کسی وقت پھول باڑی میں آکر زلیخا کو سمجھاؤں گا کہ ہم سب کو پرانی دشمنی بھول جانا چاہیے اور نئے سرے سے دوستی اور محبت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہیے۔"

قاضی امجد وہاں سے روانہ ہو گیا۔ شہید مرزا اپنے کاروبار سے لگ گیا۔ اسے دوسرے دن پھول باڑی جانا تھا لیکن اس کے دو برس کے بیٹے کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ اسے تمام دن اسپتال میں رکھنا پڑا۔ شام کو اس کی طبیعت سنبھل گئی۔ وہ اپنی بیوی سلمٰی کے ساتھ بیٹے کو لے کر گھر آیا تو کوٹھی کے باہر گیٹ پر ایک اجنبی شخص کھڑا ہوا تھا۔ گیٹ کے دربان نے کہا۔ "صاحب یہ آدمی صبح سے ادھر کھڑا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارا مینجر قاضی صاحب کا قتل ہو گیا ہے۔"

سلمٰی اور مرزا دونوں ہی قاضی سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ خبر سن کر دونوں کو صدمہ پہنچا سلمٰی کے آنسو نکل پڑے۔ انہوں نے اس شخص کو کوٹھی کے اندر بلا کر پوچھا

"قاضی کا قتل کیسے ہوا؟"

وہ بولا۔ "صاحب! وہ بہت بڑی رقم لے کر جا رہے تھے۔ پھول باڑی کے آس پاس کے علاقوں میں بھی یہ خبر پھیلی ہوئی تھی کہ پکی اینٹوں اور پکی چھتوں کی دو منزلہ مسجد تعمیر کی جا رہی ہے اور قاضی صاحب بڑی رقم لے کر شہر سے آنے والے ہیں۔ پھول باڑی کے قریب ہی تین چار ڈاکوؤں نے ایک درخت کاٹ کر سڑک پر گرا دیا تھا۔ ان کے پاس چھرے اور کلہاڑیاں تھیں۔ انہوں نے حملہ کیا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ قاضی صاحب کے پاس ایک پستول ہے۔ جب انہوں نے گولی چلائی تو وہ سب بھاگ گئے لیکن قاضی صاحب کو ایسے زخم آئے تھے کہ انہوں نے پھول باڑی پہنچ کر دم توڑ دیا۔"

سلمٰی دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ اس شخص نے کہا۔ "صاحب! ہمارے قاضی صاحب نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ مسجد کا ایک روپیہ بھی چوری ہونے نہیں دیا۔ ان کی فائرنگ کی وجہ سے ڈاکو رقم نہ لے جا سکے۔ ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ انہوں نے اللہ رسولؐ کے نام پر ایک مسجد کی خاطر جان دی ہے۔ وہ شہید ہیں۔ وہ شہید ہیں صاحب! ہماری مالکن پھول باڑی میں ان کی قبر کے پاس ایک شہید مینار بنوا رہی ہیں۔"

مرزا نے دکھ سے کہا۔ "آہ! اس کی تدفین ہو چکی ہے۔ میں اس کا آخری دیدار نہ کر سکا۔ کل ہم وہاں جائیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

☆======☆======☆

حویلی میں زلیخا بھی اپنے کمرے کا دروازہ بند کیے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی۔ "میں نے سوچا کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ میں اس کم ذات کو اپنے بدن تک پہنچنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ یہ سوچ کر ہی گھن آتی ہے کہ وہ پانچ برس تک میرے وجود سے چپکا رہا۔ اب میں پیچھا چھڑانا چاہتی تو وہ میرے پھول جیسے بچوں پر اپنا حق جتا کر انہیں مجھ سے چھین کر لے جاتا۔ اس کا یہی ایک راستہ تھا کہ اس نے مرزا سے مل کر میرے بابا کا شہید مینار بنایا ہے۔ اب میں بھی اس کا شہیدِ مینار بناؤں لیکن رقم کے معاملے میں نقصان ہوا تھا۔ میں نے راجو' دھیرو اور منگا کو پانچ پانچ ہزار کا لالچ دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ شہر سے تیس ہزار لا رہا ہے۔ وہ تینوں اسے قتل کر کے تیس ہزار چھین لیں۔ پندرہ اپنے پاس رکھیں اور پندرہ مجھے دیں۔ وہ جو میں نے مسجد کی بنیاد ڈالنے کے لیے اپنی

طرف سے آٹھ ہزار دیئے تھے۔ اس کے بدلے پندرہ ہزار حاصل کرنے والی تھی مگر اتنا زبردست منصوبہ بناتے وقت یہ بھول گئی تھی کہ قاضی کے پاس پستول رکھا رہتا ہے۔ کمبخت نے مرتے مرتے بھی مسجد کی پوری رقم بچالی مگر مجھے آٹھ ہزار کا نقصان پہنچا گیا۔ بہرحال کبھی کبھی نقصان تو اٹھانا ہی پڑتا ہے مگر اب ہمارا خاندانی وقار قائم رہے گا۔ میرے بچے آئندہ شہید قاضی امجد کی اولاد اور حبیب الرحمان کے نواسے کہلائیں گے۔"

دوسرے دن دوپہر کو سلمٰی اور شہید مرزا آئے۔ انہوں نے زلیخا سے تعزیت کی۔ وہ آنسو بہا کر روتی رہی اور دل ہی دل میں کہتی رہی۔ "میرے بابا کے قاتل! میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ہے۔"

وہ سب قاضی امجد کی قبر پر آئے۔ مسجد کمیٹی کے ارکان اور دوسرے مولوی حضرات بھی تھے۔ شہید مرزا کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر ایک کتبہ اٹھا کر اسے سینے سے لگا کر لایا۔ وہ اس کتبے کو اپنے دوست اور ماتحت قاضی امجد کی قبر کے سرہانے نصب کرنے لایا تھا۔ مسجد کمیٹی کے صدر نے کہا۔ "آپ جیسے بڑے لوگ ہمارے صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے ہیں۔ یہ ہمارے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔"

مرزا نے کہا۔ "بڑا صرف وہ ہوتا ہے جو بڑا کام کرتا ہے۔ ایمان اور نیکی کی راہ میں شہید ہوتا ہے۔ شہادت کا درجہ حاصل کرنا کوئی مذاق نہیں ہے لیکن ہم خاندانی برتری کے لیے یا ملک کی تاریخ میں اپنے پیاروں کو شہید کا مرتبہ دینے کے لیے جھوٹ اور فریب سے کام لیتے ہیں۔" مرزا نے زلیخا کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "اپنی خاندانی یا ملک کی تاریخ میں کوئی غلطی ہو تو اسے درست کر لینا چاہیے۔ میں مسماۃ زلیخا بی بی کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک شہید کی صاحب زادی ہیں لیکن یہ فخر سے کہتا ہوں کہ یہ ایک شہید کی بیوہ ہیں۔"

قاضی کی قبر کے سرہانے ذرا سی مٹی کھودی گئی تھی۔ اب مرزا وہاں وہ کتبہ نصب کر رہا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔

"شہید قاضی امجد حسین ولد چوکیدار قاضی احمد حسین........"

پیدائش اور موت کی تاریخیں بھی لکھی گئی تھیں لیکن "چوکیدار" کا لفظ پڑھ کر زلیخا کا سر چکرا گیا۔

آبروئے دوستاں

سلمان نے اسٹور کے کاؤنٹر سے.......... اورنج جوس کے دو کین لیے۔ وہ کبھی ایک چیز نہیں خریدتا تھا۔ ایک کی ضرورت ہو تو دو خریدا کرتا تھا۔ نئی کتب بھی ایک نہیں' دو خریدتا تھا۔ عادت کے مطابق اس نے اورنج جوس کے دو کین خریدے پھر دونوں ہاتھوں میں ایک ایک کین تھام کر اسپیکرز کارنر کی طرف چل پڑا۔

وہ لندن کے ہائیڈ پارک میں تھا۔ ہائیڈ پارک میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں کھڑے ہو کر کوئی بھی کسی بھی زبان میں تقریر کر سکتا ہے اور اپنے سیاسی یا مذہبی نظریات کے بارے میں کھل کر بول سکتا ہے۔ اس جگہ کو اسپیکرز کارنر کہتے ہیں۔ وہاں کامران ایک اونچی جگہ کھڑا ہوا تقریر کرنے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "دوستو! دوستی بڑی نعمت ہے۔ جس دل میں دوستی کا سچا جذبہ ہو' اس دل میں نور پیدا ہو جاتا ہے اور جسے سچا دوست مل جائے' اسے یقین ہو جاتا ہے کہ خدا اس پر مہربان ہے۔

"دوستو! یہ حقیقت سمجھنے کی ہے' سمجھانے کی نہیں ہے اور چونکہ سمجھانے کی نہیں ہے اس لیے انگریزوں کی اس نگری میں اپنی قومی زبان اردو میں تقریر کر رہا ہوں۔ آپ یہاں سے گزرتے ہوئے ذرا رک رہے ہیں' ذرا سن رہے ہیں پھریوں چلے جا رہے ہیں جیسے میں بھینس کے آگے بین بجا رہا ہوں۔"

پھر اس نے انگریزی زبان میں کہا۔ "آپ میری زبان نہ سمجھیں۔ کوئی بات نہیں۔ انسان' انسان کو نہیں سمجھتا' اس کی زبان کیا سمجھے گا؟ میں یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ انسان اپنی دنیا کی کسی بھی زبان میں دعا مانگے' خدا سن لیتا ہے اور میری دعا ہے کہ میرا دوست سلمان جیوے.......... اور ہمیشہ جیوے ہی جیوے.........."

سلمان دونوں ہاتھوں میں کین لیے گزرتے ہوئے لوگوں کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا۔ "یہ دیکھ تیرے لیے اورنج جوس لایا ہوں۔ بڑی دیر سے تقریر کر رہا ہے۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے' نیچے اتر آ.......... پلیز.........."

وہ اسٹیج نما اونچائی سے اتر کر اس کے پاس آیا پھر اس سے ایک کین لے کر بولا

"بہت زیادہ بولنے کے بعد حلق خشک ہونے لگے تو لیموں کا شربت پینا چاہیے۔"

سلمان نے کہا۔ "یہ کسی ڈاکٹر نے نہیں کہا ہے۔ تُو جانتا ہے' مجھے اورنج پسند ہے اس لیے میں یہی لے آیا۔ بچپن سے ہمارا کیا اصول ہے؟"

کامران نے کہا۔ "یہی کہ تیری پسند' میری پسند ہے اور تیری ضرورت' میری ضرورت ہے۔"

وہ سلمان کی پسند کے مطابق اورنج جوس پینے لگا۔ سلمان نے کہا۔ "بعض اوقات تیری وجہ سے بڑی فضول خرچی ہوتی ہے۔ میں ایک ناول خریدتا ہوں۔ وہ ایک ناول ہم دونوں پڑھ سکتے ہیں لیکن وہی ایک ناول تیرے لیے بھی خریدنا پڑتا ہے۔ نہ خریدوں تو' تُو ناراض ہو جاتا ہے۔"

کامران نے کہا۔ "میں بحث نہیں کروں گا۔ ہمیں آخری سانسوں تک اس مساوات کو قائم رکھنا ہے کہ جو چیز میرے پاس ہے' وہ تیرے پاس بھی رہے اور جو تیرے پاس ہے' وہ میرے پاس رہا کرے۔"

وہ جوس پیتے ہوئے پارکنگ ایریا کی طرف جانے لگے۔ دونوں نے ایک ہی رنگ کی جینز اور جرسی پہنی ہوئی تھی کیونکہ لباس کے معاملے میں ان کی یکساں پسند لازمی تھی۔

جب وہ لندن کے ایک اسکول اور ہاسٹل میں داخل ہوئے تو سلمان سات برس کا تھا اور کامران ساڑھے پانچ برس کا۔ وہ ہاسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہتے رہتے ایک ساتھ کھانے پینے' پڑھنے لکھنے اور گھومنے پھرنے کے عادی ہوتے رہے۔ ایک دوسرے کی پسند کو اپنی پسند بناتے رہے۔

ان کی اس محبت اور ایک جیسی عادت میں ایسی پختگی آتی گئی کہ "تُو تُو نہ رہا اور میں نہ رہا" والی عقیدت ان میں پیدا ہو گئی۔ جب سلمان نے ایک برس پہلے جونیئر کیمبرج کے امتحانات پاس کیے تو کامران نے کہا۔ "اب تم سینئر کیمبرج میں جاؤ گے اور ہمیشہ مجھ سے ایک برس آگے رہو گے۔"

"یہ تو مجبوری ہے۔ میں تم سے ڈیڑھ برس بڑا ہوں اور تعلیم میں ایک سال آگے ہوں۔ اس میں تو ہم مساوات برقرار نہیں رکھ سکتے۔"

"کیوں نہیں رکھ سکتے۔ تم اس سال سینئر کیمبرج میں داخلہ نہ لو۔ یعنی ایک سال ضائع کر دو۔ اگلے برس میں جونیئر کیمبرج سے پاس ہو جاؤں گا پھر ہم ایک ساتھ سینئر کیمبرج

میں رہیں گے۔"

اس نے انکار نہیں کیا۔ وہ دونوں عقیدت مندی کے اس مرحلے میں تھے' جہاں ایک دوسرے کی ناقابلِ قبول باتوں سے بھی انکار نہیں کیا جاتا۔ سلمان نے اپنا ایک سال ضائع کر دیا۔ اگلے سال دونوں ہم جماعت بن گئے۔

ہاسٹل سے لے کر اسکول تک ان کی دوستی کا چرچا تھا۔ ایک بار ٹیچر نے پوچھا۔ "تم دونوں کے باپ کا نام چوہدری رحمت علی ہے۔ جب باپ ایک ہے تو دونوں بھائی ہوئے پھر ایک دوسرے کو دوست کیوں کہتے ہو؟"

سلمان نے کہا۔ "سر! ہمارے والد ایک ہیں لیکن مائیں دو تھیں۔ میری والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔"

کامران نے کہا۔ "بھائی کا رشتہ بہت پیارا ہوتا ہے لیکن ہمیں سوتیلے بھائی کہلانا پسند نہیں ہے۔"

سلمان نے کہا۔ "کوئی سوتیلا کہتا ہے تو ہمیں یوں لگتا ہے جیسے ہمیں درمیان سے کاٹ کر الگ کیا جا رہا ہے۔"

"اس لیے ہم کبھی ایک دوسرے کو بھائی نہیں سمجھتے۔ ہمارے رشتے دار ہم سے کہتے ہیں' انکار کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی باپ کا خون ہیں۔ ٹھیک ہے' یہ حقیقت اپنی جگہ ہے لیکن ایک ہی باپ کا خون ہمارے دو ٹکڑے کرے گا تو ہم بھائی نہیں رہیں گے۔ دوست بن کر رہا کریں گے۔"

"سر! دوستی کسی باپ کے خون سے پیدا نہیں ہوتی۔ آج تک کسی ماں نے کسی دوست کو جنم نہیں دیا۔ دوستی وہ ہوتی ہے' جو آسمانی صحیفے کی طرح دل پر اترتی ہے۔ ایسی دوستی کو جان دے کر زندہ رکھنا پڑتا ہے۔"

مختلف انسان مختلف مزاج کے حامل ہوتے ہیں۔

دوستوں کے مزاج بھی مختلف ہوتے ہیں لیکن وہ رفتہ رفتہ محبت اور عقیدت سے ایک دوسرے کے ہم مزاج بنتے چلے جاتے ہیں۔

کامران کو بچپن سے تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ جوانی میں وہ کسی حد تک ایک کامیاب مصور بن چکا تھا۔ اکثر خیالوں میں کھویا رہتا تھا۔ کسی کو سامنے بٹھا کر اس کی ہُوبہُو تصویر کینوس پر بنا دیتا تھا۔

اس کے تخیل میں پختگی تھی۔ ایسے نوجوان مصور عاشق مزاج ہوتے ہیں۔ کسی آئیڈیل کے بارے میں اتنی شدت اور لگن سے سوچتے ہیں کہ اس کا ناک نقشہ اور سراپا نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس نے اپنی ڈائری میں کچھ یوں لکھا تھا۔

"وہ سامنے نہیں ہے اور میں اسے سوچتا ہوں۔"

ایسا تو ہوتا ہے فنکار اسے سوچتا ہے جو سامنے نہیں ہوتا۔ یہ سوچ جب ذرا شدید ہوتی ہے تو اس آئیڈیل کی دھندلی سی تصویر دکھائی دیتی ہے اور یہ تصویر' تصور کی اسکرین پر بنتی ہے۔ پہلے دھندلی' پھر دھیمی دھیمی اور پھر واضح ہوتے ہوتے وہ نگاہوں کے سامنے ایسے مجسم ہو جاتی ہے جیسے سچ مچ روبرو آ گئی ہو۔

"یہ میرا دعویٰ ہے کہ جب میں کسی خیالی دوشیزہ کو سوچتا ہوں تو اتنی لگن اور شدت سے سوچتا ہوں کہ وہ میرے سامنے جلوہ افروز ہو جاتی ہے۔"

کامران کی ڈائری میں اور بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ اگر لکھا ہوا نہ ہوتا تب بھی سلمان سمجھتا تھا کہ اسے چاند' ستارے' پھول' خوشبو اور حسین چہرے اچھے لگتے ہیں۔ کوئی ایک چہرہ اچھا لگے تو عشق ہوتا ہے۔ تمام چہرے اچھے لگیں تو ہوس ہوتی ہے لیکن تمام حسین چہروں کو پسند کرنے والا کامران ہوس پرست نہیں تھا' مصور تھا۔

اس کے برعکس سلمان جیتی جاگتی دنیا میں رہتا تھا۔ اس نوجوان کی بھی یہ خواہش تھی کہ کبھی اس کی زندگی میں بھی کوئی آئے اور اپنے حصے کا سارا پیار اسے دے لیکن سلمان کی اس خواہش میں شدت نہیں تھی۔

کبھی راہ چلتے کامران اسے کہنی سے ٹھوکا مار کر کہتا تھا۔

"یار! اسے دیکھ! کیسی ہے؟ اس زاویے سے تو ناک نقشہ پرفیکٹ ہے۔ میں اس کا اسکیچ بنا سکتا ہوں۔"

"میری جان! دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین ہے۔ کتنی حسیناؤں کے اسکیچ بناتا رہے گا؟"

"میں تمام عمر دنیا کے تمام حُسن کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے اندر بھرتا رہوں گا۔ تُو بیزار نہ ہوا کر۔ وہ لڑکی تو گزر بھی گئی۔ مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ کیا تجھے اچھی نہیں لگی؟"

"میں نے کب انکار کیا ہے؟ تیری پسند' میری پسند ہے اور تیری ضرورت' میری ضرورت ہے۔ یہ بچپن سے ہمارا اصول رہا ہے لیکن جوانی میں مسائل پیدا ہوں گے۔"

"مسائل کیوں پیدا ہوں گے؟"

"تُو کبھی کسی لڑکی کو شریکِ حیات بنانے کے لیے پسند کرے گا تو کیا مجھ سے کہے گا کہ میں بھی اسی کو پسند کروں؟"

"بے شک! شریکِ حیات کے معاملے میں بھی ہماری ایک پسند ہو گی۔"

سلمان نے پوچھا۔ "اور اگر میں نے اپنے لیے کوئی شریکِ حیات پسند کی تو کیا تُو بھی اسے پسند کرے گا؟"

"آف کورس۔ یہی تو ہمارا اصول رہا ہے۔ ہم ٹوٹ جائیں گے لیکن ہمارا یہ اصول نہیں ٹوٹے گا۔"

"او گاڈ! ممی اور ڈیڈی ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ تُو ایب نارمل ہے۔"

"اس میں ایب نارمل ہونے کی کیا بات ہے؟"

"میرے باپ! ہماری پسند کی لڑکی ایک ہی ہو گی۔ کیا ایسا کبھی ہوا ہے کہ ایک دلہن کے گھر دو دولہے بارات لے کر گئے ہوں؟"

"میں مانتا ہوں' ایسا نہیں ہوتا لیکن جیسا کبھی نہیں ہوتا' ویسا حیرت انگیز طور پر کبھی نہ کبھی ہو جاتا ہے۔"

"تُو حیرت انگیز طور پر لڑکی والوں سے جوتے کھلائے گا۔"

"یار' عقل سے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ میں جس لڑکی کو پسند کروں گا' تُو بالکل ویسی ہی شکل صورت کی دوسری لڑکی لے آئے گا۔"

"ایک ہی جیسی دو کتابیں خریدی جا سکتی ہیں۔ ایک جیسے دو لباس ہم خرید کر پہنتے ہیں لیکن ایک ہی جیسی دو لڑکیاں بازار سے نہیں ملتی ہیں۔"

"کسی کے گھر میں تو مل سکتی ہیں۔ جڑواں بہنیں ہم شکل ہوتی ہیں۔ ہم کسی ایسی لڑکی کو پسند کریں گے جس کی بہن اس کی ہم شکل ہو۔"

سلمان نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "یہ ممکن ہے لیکن جڑواں بہنوں کو تلاش کرنا پڑے گا۔ ان کی تلاش میں ہم بوڑھے بھی ہو سکتے ہیں۔"

وہ ہاسٹل پہنچے تو پتا چلا' پاکستان سے ان کی فون کال آرہی ہے۔ وہ دونوں کاؤنٹر کے پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ہاسٹل انچارج نے ریسیور اٹھا کر سنا پھر سلمان کی طرف ریسیور بڑھا دیا۔ اس نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو' میں سلمان

بول رہا ہوں۔ السلام علیکم ڈیڈی!"

"میں ڈیڈی نہیں' کامران کی ممی بول رہی ہوں۔ تم بیچ میں کیوں آجاتے ہو؟ ریسیور میرے بیٹے کو دو۔"

"ممی! السلام علیکم۔ آپ کامران سے بات کریں۔"

اس نے کامران کی طرف ریسیور بڑھایا۔ کامران نے کہا۔ "تُو نے ممی کو صرف سلام کیا ہے۔ کوئی بات نہیں کی' میں رِسٹ واچ دیکھ رہا ہوں۔ تُو جتنی دیر بات کرے گا' میں بھی اتنی ہی دیر بات کروں گا۔"

"یار! اوور سیز کال ہے۔ بحث نہ کر' لے بات کر۔"

کامران نے ریسیور لے کر کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو ممی! السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام بیٹے! جگ جگ جیو۔ اللہ تمہیں لمبی عمر دے۔ اتنی لمبی عمر دے کہ........"

"ٹھہریئے ممی! آپ نے اتنی دیر سلمان سے بات نہیں کی۔ دونوں کو برابر وقت دینا چاہیے۔"

"بیٹے! تم نے خواہ مخواہ اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ میں کیوں اس سے بات کروں' وہ میرا کون ہوتا ہے؟"

"ہاں۔ یہ ہمارا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ آپ کا اور میرا سوتیلا ہے۔ کیوں ہے نا؟"

"ہاں' تم درست سمجھ رہے ہو۔ سوتیلا آخر سوتیلا ہوتا ہے۔"

"رائٹ یو آر! سوتیلا ایک گالی ہے اسی لیے میں اپنے دوست سلمان کو بھائی کہہ کر یہ گالی نہیں دیتا۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ میں نے ایک سوتیلے بھائی کو مار ڈالا ہے۔ یہاں جو ہے' وہ صرف میرا دوست ہے۔"

"تم فون پر بھی بکواس کرنے سے باز نہیں آتے۔ کیا تمہیں احساس نہیں ہے کہ تمہاری محبت کی ماری ماں سات سمندر پار سے تمہیں پکار رہی ہے۔"

"پکار میں سُر ہو' سنگیت ہو' محبت اور مٹھاس ہو تو یہ کہنا نہیں پڑتا کہ ماں پکار رہی ہے۔"

"یا اللہ! مجھے موت دے دے۔"

"آپ کے بعد جو سوتیلی ماں آئے گی' میرے ساتھ وہی سلوک کرے گی جو آپ

سلمان سے کر رہی ہیں۔"

"مریں میرے دشمن۔ میں تم پر کبھی کسی سوتیلی ماں کا سایہ نہیں پڑنے دوں گی۔ توبہ ہے' میں نے کیا کہنے کے لیے فون کیا تھا اور تم نے کن باتوں میں الجھا دیا ہے۔"

"آپ یہ بتائیں ڈیڈی کیسے ہیں؟ اور کہاں ہیں؟"

"وہ خیریت سے ہیں۔ تمہارے دادا جان حج بیت اللہ کے لیے جانے والے ہیں۔ اس سے پہلے اپنی دولت اور جائیداد اولاد میں تقسیم کر رہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کر تمہارے ڈیڈی کو دو تین کروڑ روپے تو ضرور ملیں گے۔ اب تمہیں یہاں آجانا چاہیے۔ تمہارے ڈیڈی بہت بڑا کاروبار کرنا چاہ رہے ہیں اور یہ کاروبار تمہیں سنبھالنا ہے۔"

"ہم اگلے ماہ امتحانات سے فارغ ہو کر آئیں گے۔ آپ کاروبار کی فکر نہ کریں۔ میر اور سلمان سنبھال لیں گے۔"

"تم ہر معاملے میں سلمان کو کیوں گھسیٹ لیتے ہو؟ تم اپنے باپ کے ساتھ کاروبا کرو گے۔ ہم سلمان کو کچھ رقم دے دیں گے۔ وہ کوئی دکان کھول کر بیٹھ جائے گا۔"

"دکان نہیں ممی! ایک بہت بڑا اسٹوڈیو' جہاں میں پینٹنگ کرتا رہوں۔ ایسی ا خوبصورت پینٹنگ کہ ساری دنیا میں ان تصاویر کی نمائش ہوتی رہے۔ میں خوب شہر حاصل کرتا رہوں گا اور سلمان ڈیڈی کے ساتھ کاروبار سنبھالتا رہے گا۔"

وہ غصے سے بولی۔ "میرا جی چاہتا ہے' میں اپنا سر پھوڑ لوں۔ امتحانات سے فار ہوتے ہی یہاں آؤ پھر میں تم سے نمٹ لوں گی۔"

ماں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ وہ ہاسٹل انچارج کو تھینک یو کہہ کر سلمان سے بو "یار! بڑی مشکل ہے۔ ممی بڑی جلدی ناراض ہو جاتی ہیں۔ خدا حافظ کہنے سے پہلے انہوں نے فون رکھ دیا۔"

"تُو باتیں ہی ایسی کرتا ہے کہ وہ ناراض ہو جاتی ہیں۔"

"میں دونوں طرف سے برابر تولتا ہوں۔ گفتگو متوازن ہو پھر بھی لوگ ناراض جاتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے' ہم سب کو خوش نہیں رکھ سکتے۔"

وہ اپنے کمرے میں آگئے۔ کامران ایک تصویر بنانا چاہتا تھا۔ سلمان نے کہا "ہر نہیں۔ جب تک امتحانات ختم نہیں ہوں گے' تُو ایک تصویر بھی نہیں بنائے گا۔ چل' یہ بزنس میتھڈ کی کتاب نکال رہا ہوں۔ اسے سمجھ اور نوٹس بنا۔"

"یار! کہاں آرٹ اور کہاں بزنس؟ تُو مجھے آسمان سے زمین پر لے آتا ہے۔"

"میں نے تیرے لیے ایک سال ضائع کیا ہے تاکہ ہم تعلیم میں بھی برابر رہیں۔ اگر تُو فیل ہو جائے گا تو برابری نہیں رہے گی۔ اگر تُو اسٹڈی نہیں کرے گا' میرے ساتھ پاس نہیں ہو گا تو میں امتحان نہیں دوں گا۔ پاکستان چلا جاؤں گا۔"

خیالوں کی دنیا میں رہنے والے کو تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن سلمان کے ساتھ رہنے اور اس کی خوشی میں خوش رہنے کے لیے اس کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں دل لگائے رکھنے کی کوششیں کرتا تھا۔

وہ ویک اینڈ میں ایسٹ بورن آئے۔ چھٹیوں کے دنوں میں سمندر کے ساحل پر دور تک بڑی چہل پہل اور رونق رہتی تھی۔ ہر عمر کی عورتیں اور لڑکیاں مختصر لباس میں غسل کرتیں اور ہنستی کھیلتی نظر آتی تھیں۔ طرح طرح کے کھیل تماشے ہوتے تھے۔ شراب خانے اور نائٹ کلب رات گئے تک جاگتے رہتے تھے اور دل والوں کو جگائے رکھتے تھے۔

امتحانات قریب تھے۔ سلمان تفریح کے موڈ میں نہیں تھا لیکن کامران نے ضد کی کہ وہیں ساحل پر بیٹھ کر پڑھائی بھی ہو گی اور نظارے بھی کئے جائیں گے۔ سلمان نے ایک ریستوران کے ٹیرس پر آکر کہا۔ "یہ جگہ مناسب ہے۔ یہاں ریلنگ کے پاس بیٹھ کر آنکھیں بھی سینکتے رہو اور پڑھتے بھی رہو۔ میں تمہیں شام سے پہلے اٹھنے نہیں دوں گا۔"

وہ مجبوراً سلمان کے ساتھ وہاں بیٹھ کر پڑھتا رہا پھر وہ شام کو ساحل پر ٹہلنے کے لیے آگئے۔ دنیا کے تمام ساحلوں پر جو سب سے اہم چیز نظر آتی ہے' وہ دولت ہے۔ اس کے بغیر تفریح اور خوش حالی ممکن نہیں ہوتی۔ وہاں قلاش اور پھکڑ قسم کے لوگ بھی مفت نظاروں کے لیے آتے ہیں۔ حسرت سے حسین عورتوں اور مہنگے کلبوں کو دیکھتے ہیں۔ ان بے چاروں پر پولیس والے نظر رکھتے ہیں اور انہیں وہاں سے دور بھگاتے رہتے ہیں۔

آفتاب مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ شفق کی سرخی آسمان کے کناروں اور سمندر کی لہروں پر دور تک پھیل رہی تھی۔ ایسے وقت وہ نظر آئی۔ وہ ایک ساحلی چٹان پر کھڑی ہوئی تھی۔ سمندر کی لہریں بار بار اس چٹان سے آکر یوں ٹکرا رہی تھیں جیسے اس حسینہ کے قدموں میں سر پٹخ رہی ہوں اور عاشق نامراد کی طرح اس کے حسن کی خیرات مانگ رہی ہوں۔

ہر نظر مانگتی ہے۔ دید ہو تو دیدار مانگتی ہے۔ وہ ایسی حسین اور دلنشین تھی کہ دیکھنے

والی آنکھیں اس کی بھیک مانگنے لگتی تھیں۔ اس کا لباس بتا رہا تھا کہ وہ مشرقی ہے اور شاید پاکستانی ہے۔ اس کے دوپٹے کا آنچل' کھلی ہوئی زلفوں کے ساتھ لہرا رہا تھا۔ سمندر بھی لہرا رہا تھا اور ایسے میں دل تو لہراتا ہی ہے۔

وہ دونوں اسے دیکھنے لگے۔ کامران نے کہا۔ "نیلے آسمان کے پس منظر میں بکھری ہوئی زلفیں' اڑتا ہوا آنچل۔ یہ خیالی دوشیزہ ہے۔"

سلمان نے کہا۔ "یہ خیالی نہیں' حقیقت ہے۔ یوں لگ رہی ہے' جیسے آسمان کی بلندی سے ابھی اتر کر آئی ہو۔"

"ایسے قدم زمین پر نہیں' دل پر اترتے ہیں۔"

سلمان کی زندگی میں وہ پہلی لڑکی تھی' جسے وہ دل کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "کوئی ایک ہی ایسی ہوتی ہے جسے دیکھ کر چھونے کو جی چاہتا ہے۔"

کامران نے کہا۔ "چھونے سے کرنٹ لگے گا۔"

سلمان نے کہا۔ "کوئی نہیں چاہتا کہ بجلی گرے مگر میں چاہتا ہوں کہ یہ بجلی مجھ پر گرے۔"

کامران نے کہا۔ "مجھ پر نہیں' ہم پر گرے۔"

ساحل پر اچھی خاصی رونق تھی لیکن وہ سب سے الگ' کچھ تنہا تنہا سی لگ رہی تھی۔ جیسے اس کے اپنے اسے ساحل پر چھوڑ کر چلے گئے ہوں یا وہ کہیں بھٹک کر آگئی ہو اور سمندر سے پوچھ رہی ہو' میرا کون ہے؟ کوئی ہے تو کہاں ہے؟ اور کہیں ہے تو کب میری سانسوں کی سرگم تک پہنچنے آئے گا؟

اس عمر میں ہر لڑکی سمندر ہوتی ہے۔ لہروں کی طرح ساحل کو پوچھنے آتی ہے پھر یوں واپس جاتی ہے' جیسے ساحل نہ ملا ہو۔

وہ دونوں اس کے قریب ذرا فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ اگر وہ ان کی طرف آتی تب بھی ساحل کی طرح گم صم کھڑے رہتے۔ نہ روک پاتے اور نہ اس سے بول پاتے۔ وہ سحر زدہ کھڑے تھے۔

پھر دور سے آنے والی لڑکیوں میں سے ایک نے اسے آواز دی۔ "آبرو!"

اس نے پلٹ کر سہیلیوں کی طرف دیکھا۔ پلٹنے کے دوران میں سلمان اور کامران کو بھی دیکھا۔ یہ سمجھ لیا کہ اس کی محویت کے دوران میں پتا نہیں' وہ کب سے اسے دیکھ

رہے تھے۔ وہ جھجکتی ہوئی دوپٹے کو یوں اِدھر اُدھر سے سنبھالنے لگی جیسے چوروں سے اپنا بدن چھپا رہی ہو۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ چھپانے سے مال کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔

لیکن وہ ایک مشرقی لڑکی تھی۔ حیا سے مجبور تھی۔ سینے کو ڈھانپ کر' سر پر آنچل رکھتے ہوئے سہیلیوں کی طرف جانے لگی پھر وہ ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگیں۔ فاصلہ بڑھ گیا تھا اس لیے وہ دونوں کچھ سن نہ سکے۔ کامران نے کہا۔ "ہم تو یوں کھڑے ہیں جیسے پاکستان میں ہوں۔ بھئی ہم یورپ میں ہیں۔ اس سے متعارف ہو چکے ہیں۔"

سلمان نے کہا۔ "ہم پاکستان میں نہیں ہیں لیکن اس کے پیروں میں پاکستانی سینڈل ہے۔"

"یار! جب وہ یہاں ہے تو یہاں کے طور طریقے جانتی ہو گی۔ دل نہیں چاہے گا' تب بھی رسمی طور پر مسکرا کر چند فقرے بولے گی۔ ہم اسے مسکراتے ہوئے تو دیکھ لیں گے۔"

وہ دونوں آگے بڑھے۔ ان سے پہلے وہ سہیلیوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اس نے جاتے جاتے ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ دونوں کو گمان ہوا۔ "مجھے دیکھا ہے.......... نہیں' مجھے دیکھا ہے۔"

کوئی حسینہ پلٹ کر دیکھ لے تو خوشی ہوتی ہے کہ وہ قابلِ دید ہیں اس لیے دیکھے جا رہے ہیں۔ دیکھنے کے انداز سے یہ خوش فہمی بھی ہوتی ہے کہ دل پیچھے رہ گیا ہے اور وہ آگے بڑھ رہی ہے۔ بعض مغرور حسیناؤں کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے پلٹ کر نگاہوں سے کہہ رہی ہوں "آؤ ٹامی! کم آن' تو تو............تو تو............"

وہ سہیلیوں کے ساتھ سڑک کے کنارے ایک ویگن کے پاس پہنچ گئی۔ وہ دونوں بھی پیچھے پیچھے چلے آئے۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول رہی تھیں۔ کامران نے کہا "ایکسکیوزمی!"

وہ سب انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں' وہ بولا۔ "میرا نام کامران ہے اور یہ میرا دوست سلمان ہے۔"

آبرو نے سلمان کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ سلمان نے اسے مخاطب کیا۔ "مس آبرو!"

وہ نظریں چرانا بھول گئی۔ اس نے چونک کر سلمان کو دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا تم مجھے جانتے ہو؟"

"صرف نام جانتا ہوں۔ ابھی تمہاری سہیلی نے تمہیں اس نام سے مخاطب کیا تھا۔"

"او آئی سی۔ کچھ کہنا ہے؟ اپنی پرابلم؟"

سلمان ہچکچانے لگا۔ کامران نے جلدی سے کہا۔ "یہ سچ بولتے ہوئے جھجک رہا ہے۔ ہمارے ساتھ واقعی پرابلم ہے۔"

ایک لڑکی نے پوچھا۔ "کیا پیدل ہو۔ گاڑی نہیں ہے؟ لفٹ چاہتے ہو؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ ابھی ہم دونوں میں سے کسی ایک کو پچاس پاؤنڈ ہارنا ہو گا۔"

"اچھا تو کوئی شرط لگائی گئی ہے؟"

"بالکل! یہی بات ہے۔ سلمان کہتا ہے مس آبرو پاکستانی ہیں اور میں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ ہندوستانی ہیں۔"

آبرو نے دونوں کو باری باری دیکھا۔ کامران نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے ہی جیتنا ہے۔ میرا یہ دوست عقل سے کام نہیں لیتا ہے۔ اس نے تمہارے ماتھے کی بندیا کی طرف دھیان نہیں دیا اور شرط لگا لی۔ میں نے فوراً عقل سے کام لیا اور سوچا کہ ہندوستان میں مسلمان لڑکیاں سنگار کے طور پر بندیا لگاتی ہیں۔"

آبرو نے کہا۔ "تم نے اپنی عقل کے مطابق رائے قائم کی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ رائے درست ہو۔ یہ میری سہیلی پوجا ہے اور یہ سندھیا ہے۔ انہوں نے محبت سے یہ بندیا لگا دی۔ میں پاکستانی ہوں۔ اپنی سہیلیوں کا دل نہیں توڑتی۔ سو سوری' تم پچاس پاؤنڈ ہار چکے ہو۔"

وہ دروازہ کھول کر گاڑی کے اندر چلی گئی۔ دوسری لڑکیاں بھی گاڑی میں جا کر بیٹھ رہی تھیں۔ وہ دونوں بڑی چاہت سے' بڑی لگن سے گاڑی کے اندر اسے دیکھ رہے تھے۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ نظارہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس رات وہ دونوں ہاسٹل کے کمرے میں خاموش رہے۔ اپنی اپنی کتاب کھول کر یوں بیٹھے رہے جیسے پڑھ رہے ہوں۔ سلمان کو نگاہوں سے تصادم یاد آ رہا تھا پھر نظریں چرانے کا انداز ایسا تھا جیسے ایک نظر میں اسے چرا رہی ہو۔

کامران کی نظریں بھی کتاب پر تھیں مگر وہ کتابی چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس مصور کا

حافظہ اتنا تیز تھا کہ اس کے چہرے کے تمام نقوش اس کے ذہن میں نقش ہو گئے تھے۔ وہ جب چاہتا' اسے کینوس پر اتار کر اس کی تصویر میں آرزوؤں کے تمام رنگ بھر سکتا تھا۔

سلمان نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔ "یار! مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں صبح اٹھ کر پڑھوں گا۔ جو تو کرتا ہے' وہ میں کرتا ہوں۔ اس لیے میں سو رہا ہوں' تو بھی سو جا۔ لائٹ آف کر دے۔"

وہ کتاب ایک طرف رکھ کر لیٹ گیا۔ کامران نے کہا۔ "تو کہہ رہا ہے تو سونا ہی ہو گا مگر ایک مہربانی کر۔ مجھے اس کا اسکیچ بنانے دے پھر لائٹ آف کر دوں گا۔"

"ہرگز نہیں' میں کہہ چکا ہوں.......... امتحانات ختم ہونے سے پہلے تو کینوس کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ جو کہہ دیا' وہ پتھر کی لکیر ہے۔ لائٹ آف کر دے۔"

کامران نے اسے بے بسی سے دیکھا پھر اسے گھونسا دکھایا۔ اس کے بعد لائٹ آف کر دی۔ کمرے میں اندھیرا ہوتے ہی وہ اور زیادہ روشن ہو گئی۔ کروٹ کروٹ نظر آنے لگی۔ سلمان کے مزاج میں سنجیدگی تھی' رومانیت نہیں تھی لیکن اس بار وہ اپنے مزاج کے خلاف اسے یاد کر رہا تھا اور بھولنے کی کوشش کرتے ہوئے سو جانا چاہتا تھا۔

آخر وہ سو گیا لیکن صبح اٹھتے ہی اس سوچ میں پڑ گیا کہ سو رہا تھا یا اسے سوچ رہا تھا یا سونے اور سوچنے کے دوران خوابیدہ سا جاگ رہا تھا۔

وہ آنکھیں کھول کر تھوڑی دیر تک چھت کو تکتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کامران دوسرے بستر پر سو رہا تھا۔ بستر کے قریب ایزل پر کینوس رکھا ہوا تھا۔ اس کینوس پر چارکول سے اس کا اسکیچ بنا ہوا تھا۔ سلمان اسے دیکھتے ہی بستر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ایزل کے قریب آ کر دیکھا۔ کینوس پر وہ مسکرا رہی تھی۔

بالکل وہی تھی۔ وہی ناک نقشہ تھا۔ وہی دل میں اتر جانے والی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں تھیں۔ سلمان کو لگ رہا تھا' وہ اسے دیکھ رہی ہے۔ مسکرا رہی ہے اور پوچھ رہی ہے۔ "نیند آئی تھی؟"

وہ اسے دیکھتا رہا۔ اسے یاد آیا' کامران نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔ "وہ سامنے نہیں ہے اور میں اسے سوچتا ہوں۔ اتنی لگن سے اور شدت سے سوچتا ہوں کہ وہ میرے سامنے جلوہ افروز ہو جاتی ہے۔ میرے تخیل کی شدت حیرت انگیز طور پر غیر معمولی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو ابھی تک خیال کے پیچھے چھپی ہوئی ہے' وہ ضرور آج سامنے آئے

گی۔"

اس نے سر گھما کر کامران کو دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے تخیل کی شدت سے آبرو کو اپنی نگاہوں کے سامنے بلایا ہو گا اور اس کا اسکیچ بنانے کے دوران میں اس سے خوب باتیں کی ہوں گی۔

سلمان نے سوچا۔ "مجھے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ صرف اس کے تخیل میں شدت نہیں ہے۔ اس کے پیار میں بھی شدت ہے۔ آبرو اس کے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔ مجھے پچھلی رات کی طرح کروٹیں نہیں بدلنا چاہیے۔ اسے یاد نہیں کرنا چاہیے۔ ایسی کتنی ہی پرکشش لڑکیاں ہیں جو آتی ہیں اور نظروں کے سامنے سے گزر جاتی ہیں۔ آبرو بھی گزر چکی ہے۔ اب میں اس کے بارے میں نہیں سوچوں گا۔"

وہ تصویر سے منہ پھیر کر غسل کرنے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ زندگی رفتہ رفتہ بہت کچھ سکھاتی ہے۔ سلمان بھی سیکھنے والا تھا کہ زندگی میں کوئی ایک بات ایسی ہوتی ہے جو اپنے اختیار سے باہر ہوتی ہے۔ کوئی ایک جذبہ ایسا ہوتا ہے جسے اندر آنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ اگر روکا جائے تو دروازہ توڑ کر گھس آتا ہے۔

امتحانات ختم ہو گئے۔ پاکستان واپس جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ روانگی سے ایک دن پہلے کامران دوڑتا ہوا کمرے میں پہنچا اور سلمان کے سامنے ہانپتے ہوئے کچھ کہا۔ اس کی آدھی بات ہانپنے میں ضائع ہو گئی۔ سلمان نے کہا۔ "پہلے ہانپ لے پھر آرام سے بولنا۔"

اس نے انکار میں سر ہلا دیا پھر سلمان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یار! کچھ بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے؟ مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟"

وہ اسے کھینچتے ہوئے، ہاسٹل کے باہر آتے ہوئے بولا۔ "وہ......، وہ ہے۔ ہو ہو ہو.......... اُدھر ہے۔"

"کون ادھر ہے؟"

"ہا۔ ہا۔ آبرو.........."

سلمان کا دل یکبارگی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ انجان بن کر بولا۔ "کون آبرو!"

وہ سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "جب بھی میں اس کا نام لیتا ہوں تو انجان بن [illegible] ہے۔ مجھے الو کا پٹھا سمجھتا ہے۔ کیا میں اتنا نہیں سمجھتا ہوں کہ تو اس سے کترا رہا

ہے۔"

وہ ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ کامران نے کہا۔ "ایسٹ لندن چلو۔"

سلمان نے پوچھا۔ "ایسٹ لندن کس لیے جا رہا ہے؟"

"میں نے وہاں کی ایک اسٹریٹ میں آبرو کو دیکھا ہے۔ وہ اس اسٹریٹ کے ایک اپارٹمنٹ کے اندر جا رہی تھی۔"

"آخر تُو نے اسے ڈھونڈ ہی لیا۔"

"ہاں۔ وہ کسی شاعر نے کہا ہے نا کہ عشق سچا ہو تو محبوبہ کچے دھاگے سے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ آج اس نے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف کھینچ ہی لیا ہے۔"

"کیا تُو نے وہاں جا کر اس سے ملاقات کی تھی؟"

"تیرے بغیر کیسے ملاقات کرتا؟ آج اس سے فائنل بات ہو گی۔"

"کون سی فائنل بات؟"

"یہی کہ وہ ایک ہے اور ہم دو ہیں۔ اس کی کوئی جڑواں بہن ہے یا نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو اس کی ہم شکل ہے یا نہیں؟"

"تیرا دماغ چل گیا ہے۔ ہم صرف اس کا نام جانتے ہیں۔ اس کے ماں باپ اور اس کے خاندان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں۔ اس سے ایک ملاقات کے بعد دوسری ملاقات نہیں ہوئی اور تُو دوسری ملاقات پر رشتہ جوڑنے کی اور اس کی جڑواں بہن پیدا کرنے کی باتیں کرے گا۔ نہیں، میں تیرے ساتھ جوتے کھانے نہیں جاؤں گا۔"

"ہم ہمیشہ ایک پلیٹ میں کھاتے رہے ہیں۔ جوتے ملیں گے تو وہ بھی برابر کھائیں گے۔ تُو خواہ مخواہ ڈرتا ہے۔ کسی سے یہ پوچھنا جرم تو نہیں ہے کہ اس کی کوئی جڑواں بہن ہے یا نہیں؟ کیا پولیس پکڑ لے جائے گی؟"

دیکھ کامران! ہر بات سہولت سے کی جاتی ہے۔ ہر کام اس کے مناسب وقت پر کیا جاتا ہے۔ پہلے ہم یہ معلوم کریں گے کہ وہ لندن میں عارضی طور پر آئی ہے یا والدین کے ساتھ یہاں رہتی ہے؟ اور اگر اس کا مستقل قیام پاکستان میں ہے تو پھر اس کا پتا اور فون نمبر وغیرہ نوٹ کریں گے۔"

وہ قائل ہو کر بولا۔ "ہاں۔ اس طرح ہم باتوں ہی باتوں میں معلوم کریں گے کہ اس کے والدین نے جڑواں بیٹیاں پیدا کی ہیں یا نہیں؟"

"میں تجھ سے کئی بار کہہ چکا ہوں' مجھے آبرو سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ مجھے پسند نہیں ہے۔"

"خبردار! اصول کے خلاف نہ بولنا۔ جو میری پسند ہے' وہ تیری پسند ہے۔ جو تیری ضرورت ہے' وہ میری ضرورت ہے۔"

"یہ لڑکی کا معاملہ ہے۔ ہمیں اپنے اصول میں لچک پیدا کرنی ہوگی۔"

"ہرگز نہیں۔ ہم نے قسم کھائی تھی کہ اصول کبھی نہیں توڑیں گے۔"

"وہ ہماری نادانی تھی۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ جوانی میں یہ مسئلہ پیدا ہوگا۔ میری جان! اگر اس کی کوئی ہم شکل نہ ہوئی تو کیا کرے گا؟"

وہ بڑے دکھ سے بولا۔ "میں آبرو کی محبت سے باز آجاؤں گا۔ اس کی صورت کو صرف کینوس سے ہی نہیں' اپنے دل سے بھی مٹا دوں گا۔"

سلمان نے اسے بڑی محبت سے دیکھا پھر کہا۔ "تُو اس کا دیوانہ ہے اور میری خاطر اسے چھوڑ دے گا۔ میرے یار! تُو میرے لیے کیسی کیسی قربانیاں دیتا رہے گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "یار! جذباتی انداز میں سوچا جائے تو یہ قربانی ہے ورنہ حقیقت کیا ہے؟ یہ ہے کہ ہم اپنی ہر پیاری چیز چھوڑ کر دنیا سے جاتے ہیں۔ میں آبرو کو بھی چھوڑ کر جاؤں گا۔"

وہ اسے بے بسی سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "ایک عقل کی بات کہتا ہوں۔ شاید تیری سمجھ میں آجائے۔ دوست اگر حد سے زیادہ دوستی کرے گا اور اپنی دوستی کو پہاڑ بنا دے گا تو دوسرا دوست پہاڑ تلے دب کر رہ جائے گا۔ اس کا دم نکل جائے گا پھر کیا اسے دوستی کہیں گے؟"

وہ آلڈگیٹ کے اس اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ کامران نے کرایہ ادا کر کے ٹیکسی والے کو رخصت کیا پھر دروازے پر آکر کال بیل کا بٹن دبایا۔ یہاں کی اکثر گلیوں میں کوڑا کرکٹ پھیلا رہتا ہے۔ مکانات اور عمارات کی بھی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ یہاں لندن کا زیادہ تر غریب طبقہ آباد تھا۔

کال بیل کا بٹن دبانے سے کافی دیر بعد بھی دروازہ نہیں کھلا۔ سلمان نے کہا۔ "کال بیل کام نہیں کر رہی ہے۔ دستک دے۔"

دروازے پر دستک دی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی انگریز خاتون نے دروا

کھولا۔ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ کامران نے کہا۔ "میڈم! ہم زحمت دینے کی معافی چاہتے ہیں۔ دراصل ہم مس آبرو سے ملنے آئے ہیں۔"

"مس آبرو!" خاتون نے کہا۔ "یہاں اس نام کی کوئی لڑکی نہیں ہے۔"

"میڈم! وہ پاکستانی ہے۔ میں نے دو گھنٹے پہلے اسے یہاں دیکھا تھا۔"

"اچھا سمجھ گئی' وہ میری بیٹی جولی کی سہیلی ہے۔ یہاں آئی تھی پھر جولی کو ساتھ لے گئی۔"

"کیا آپ بتا سکتی ہیں' وہ کہاں گئی ہوں گی؟"

"سوری۔ میں نہیں جانتی ہوں۔ جوان لڑکیاں ہیں۔ پتا نہیں کہاں گھومتی پھر رہی ہوں گی۔"

"کیا آپ مس آبرو کے گھر کا پتا جانتی ہیں؟"

"نہیں بیٹے! جولی کی اس سے نئی نئی دوستی ہوئی ہے۔ ہم آبرو کے بارے میں نہیں جانتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں میڈم! ہم نے آپ کو زحمت دی پھر ایک بار معذرت چاہتے ہیں۔"

خاتون نے دروازہ بند کر لیا۔ سلمان نے کہا۔ "تم نے خواہ مخواہ یہاں تک دوڑایا ہے۔ اب اسے کہاں ڈھونڈو گے؟"

وہ گلی میں آگئے۔ کامران نے کہا۔ "ہمیں یہ یقین کر لینا چاہیے کہ آبرو کی کوئی جڑواں ہم شکل بہن نہیں ہے۔ ہمیں اس کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔"

سلمان نے کہا۔ "لومڑی کو جب انگور نہیں ملے تھے تو اس نے انہیں کھٹا قرار دے دیا تھا۔"

کامران چلتے چلتے پھسل گیا۔ سلمان نے اسے سنبھالنا چاہا تو دونوں توازن قائم نہ رکھ سکے۔ ایسے گرے کہ دور تک پھسلتے چلے گئے۔ تمام لباس کیچڑ سے آلودہ ہو گیا۔ کامران نے اٹھتے ہوئے اور سلمان کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "غالب کا کوئی شعر ہے کہ عشق میں آدمی نکما ہو جاتا ہے' کیچڑ میں چلنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔"

سلمان نے گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچ کر پوچھا۔ "ہم اس حالت میں ہاسٹل تک کیسے جائیں گے؟"

"یہاں آلڈ گیٹ کی دکانوں میں سستے ریڈی میڈ کپڑے مل جاتے ہیں۔ ہم کپڑے خرید کر حمام میں جائیں گے۔ غسل کریں گے پھر نیا لباس پہن کر ہاسٹل میں جائیں گے۔"

وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔ کامران کے پاس چار پاؤنڈ تھے۔ اس نے سلمان سے پوچھا۔ "تمہارے پاس کتنے ہیں؟"

"میرے پاس رقم کہاں سے آئے گی۔ میں کمرے میں جس حالت میں بیٹھا ہوا تھا' تم مجھے اسی حالت میں کھینچتے ہوئے لے آئے تھے۔ مجھے تھوڑی بہت رقم لینے کا موقع نہیں دیا۔"

"یار! چار پاؤنڈ میں کیا ہوگا۔ ہمیں ٹیکسی یا بس میں ہاسٹل پہنچنا ہے۔"

وہاں ایک بازار میں سستے کپڑے فروخت کئے جاتے ہیں۔ وہ بازار میں جہاں سے گزرتے گئے' لوگ اپنی اپنی ناک چٹکی سے دبائے ان سے کترا کرانہیں سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہاں پرانے ملبوسات بھی تھے اور نئے بھی۔ جو نئے تھے۔ اس کے لیے چار پاؤنڈ ناکافی تھے اور وہ پرانے ملبوسات یعنی کس کی اترن نہیں پہننا چاہتے تھے۔ ایک لباس تین پاؤنڈ میں حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ کسی حمام میں جا کر کیچڑ سے آلودہ کپڑے دھو کر انہیں نہیں پہن سکتے تھے۔ ایک تو حمام میں صرف غسل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ کپڑے دھونے سے منع کیا جاتا ہے پھر لباس میں کیچڑ کے علاوہ ایسی گندگی لگی تھی کہ وہ انہیں دھو کر بھی پہننا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

آخر وہ تین پاؤنڈ میں ایک سلیپنگ گاؤن اور ایک پاجامہ خرید کر حمام میں آئے۔ حمام والا دو آدمیوں کے ایک پاؤنڈ مانگ رہا تھا اور اب ان کے پاس ایک پینس بھی نہیں تھا۔ آخر حمام والے نے ان کی حالت پر ترس کھا کر انہیں غسل کرنے کی اجازت دے دی۔

جب وہ نہا دھو کر' کیچڑ سے پاک ہو کر حمام سے باہر آئے تو سلمان نے صرف پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ اوپر سے بدن ننگا تھا۔ کامران نے اوپر سے سلیپنگ گاؤن کو لپیٹ رکھا تھا اور نیچے لباس سے محروم تھا۔ ویسے گاؤن اتنا لمبا تھا کہ ستر پوشی ہو گئی تھی لیکن صاف پتا چلتا تھا کہ گاؤن کے سائے میں وہ ننگا ہے۔ اگرچہ غلاظت سے پاک ہو گئے تھے' بہت صاف ستھرے نظر آرہے تھے لیکن پہلے سے زیادہ مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر سے گزرنے والے انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سستے شاپنگ بیگ تھے

جن میں کیچڑ آلود کپڑے تھے۔ سلمان نے کہا۔ "جلدی ٹیکسی پکڑو اور نکل چلو۔ ہم مذاق بن رہے ہیں۔"

"ہم یہ گندے کپڑے کہاں لے جائیں گے؟ پہلے انہیں پھینکا جائے۔"

وہ آگے بڑھ کر کچرا گھر تلاش کرنے لگے۔ فٹ پاتھ سے گزرنے والی عورتیں انہیں نیم برہنہ دیکھ کر دور سے کترا کر گزر رہی تھیں۔ بچے ہنس رہے تھے۔ لوگ مسکرا رہے تھے۔ آخر ایک جگہ کچرے کا ڈھیر نظر آیا۔ انہوں نے اپنے اپنے شاپنگ بیگ وہاں پھینک دیئے۔ پھر تیزی سے چلتے ہوئے بڑی سڑک پر آئے تاکہ فوراً ٹیکسی میں بیٹھ کر ہاسٹل پہنچ سکیں۔

جب پریشانی بڑھتی ہے تو کم نہیں ہوتی۔ وہ جتنی جلدی چاہتے تھے' ٹیکسی ملنے میں اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ فون کر کے ٹیکسی بلانے کے لیے رقم نہ تھی نہ کارڈ تھے۔ سلمان نے جھنجلا کر کہا۔ "تو بالکل گدھا ہے۔ باہر نکلنے سے پہلے جیب دیکھ لینا چاہیے۔ ہم تو بھوکوں اور ننگوں سے گئے گزرے دکھائی دے رہے ہیں۔"

کامران نے کہا۔ "جب تم ہاسٹل میں رہتے ہو تو جیب میں کچھ رقم کیوں نہیں رکھتے؟"

"کیوں رکھوں؟ کیا ہمیشہ جیب میں رقم رکھی جاتی ہے؟ ویسے آج سبق حاصل ہو گیا ہے۔ تو کسی بھی وقت ایمرجنسی مجھے گھسیٹ کر لے جا سکتا ہے۔ میں آئندہ ٹوائلٹ میں بھی جاؤں گا تو کچھ رقم اپنے پاس رکھا کروں گا۔"

کامران دور دور تک نظریں دوڑانے لگا۔ یہ محض اتفاق تھا' ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ بولا۔ "ہم کسی ٹیکسی کو روکیں بھی تو وہ شاید نہ رکے۔ ہمیں ننگا دیکھ کر ڈرائیور سوچے گا کہ ہم کرایہ نہیں دے سکیں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دور سے ایک ٹیکسی آتی نظر آئی۔ وہ دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔ آخر وہ ان کی طرف آنے لگی۔ سلمان نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے' ٹیکسی مل ہی گئی۔"

وہ ان کے سامنے آکر رک گئی۔ سلمان نے آگے بڑھ کر پچھلا دروازہ کھولا پھر جیسے ہی اندر جا کر بیٹھنا چاہتا تھا' کامران نے چیخ مارتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ سلمان نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ سلمان کو نظرانداز کرتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔ ”سوری ہم نہیں جائیں گے۔“

ٹیکسی آگے چلی گئی۔ سلمان نے غصے سے کہا۔ ”تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ سردی سے ہماری قلفی جم رہی ہے بڑی مشکل سے ایک ٹیکسی..........“

کامران نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہماری منزل مل گئی۔ وہ دیکھ‘ آبرو..........“

سلمان نے چونک کر اُدھر دیکھا پھر بے اختیار دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ اپنی سہیلیوں کے درمیان ان سے ذرا دور تھی لیکن نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہ بھی آگے بڑھتے بڑھتے ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ وہیں رک گئی تھی۔ اس کی تمام سہیلیاں انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

سلمان نے دانت پیس کر کامران سے کہا۔ ”ہمیں اپنا مذاق اڑوانے کے لیے یہاں نہیں رکنا چاہیے تھا۔“

”ارے واہ! کیسے نہ رکتے؟ جس کی تلاش میں ہم نے اتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں‘ وہ اب مل رہی ہے تو کیا اسے چھوڑ کر چلے جاتے؟“

”کیا اس حالت میں ملے گا؟ میرے اوپر نہیں ہے۔ تیرے نیچے کچھ نہیں ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔ ہم اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ کسی بھی حال میں رہیں‘ اعلیٰ رہیں گے۔“

”اگر اعلیٰ ایسے ہوتے ہیں تو پہلے تُو جا۔ میں پیچھے آ رہا ہوں۔“

کامران مسکرا کر آبرو کی طرف جانے لگا۔ آبرو نے پریشان ہو کر کہا۔ ”وہ ہماری طرف آ رہے ہیں۔ او گاڈ! لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔“

سندھیا نے کہا۔ ”ہمیں راستہ بدل لینا چاہیے۔“

وہ سب بائیں طرف گھوم کر تیزی سے جانے لگیں۔ وہ دونوں بھی تیزی سے سڑک پار کر کے ان کے پیچھے جانے لگے۔ جولی نے پلٹ کر دیکھا پھر کہا۔ ”کیا مصیبت ہے‘ وہ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔“

پوجا نے کہا۔ ”ہم اس مصیبت میں آبرو کا ساتھ چھوڑ دیں تو ہمیں نجات مل جائے گی کیونکہ وہ دیوانے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔“

آبرو نے پوچھا۔ ”کیا اس مصیبت میں ساتھ چھوڑ دو گی؟“

وہ سب ایک قریبی ریستوران کے سامنے رک گئے۔ سلمان نہیں چاہتا تھا کہ ایسی حالت میں اندر جائے لیکن سینے کے اندر دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔ اسے قریب سے دیکھے‘ اس کی آواز سنے۔ وہ پاکستان جا رہا ہے۔ پتا نہیں‘ پھر کبھی اس کا دیدار ہو یا نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ اس سے مستقل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ فون‘ خط و کتابت کے ذریعے دل کو قرار آتا رہتا۔

کامران نے پوچھا۔ ”یہاں کیوں رک گیا؟ اندر چل۔“

”یار! لوگ کیا کہیں گے؟ وہ کیا سوچے گی؟“

”یہاں باہر بھی لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ آبرو نے بھی ہمیں دیکھ لیا ہے۔ اسے جو سوچنا چاہیے‘ وہ سوچ لیا ہو گا پھر ہم بتائیں گے کہ ہماری یہ حالت اسی کے عشق میں ہوئی ہے۔“

سلمان جھجکتا ہوا‘ اس کے ساتھ ریستوران کے اندر آ گیا۔ وہ ایسی حالت میں تھے کہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔ آبرو ایک گوشے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک بڑی میز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کر گھبرا کر بولی
”او گاڈ! کہیں یہ دونوں مجھے مخاطب نہ کریں۔ لوگ کیا سمجھیں گے؟“

وہ دونوں قریب آ گئے۔ کامران نے ایک ہاتھ اٹھا کر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہائے آبرو! تم نے پہچانا؟ ہم وہی ہیں۔“

پوجا نے کہا۔ ”بابا! معاف کرو۔ ہمارے پاس چینج نہیں ہے۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہم بھکاری نہیں ہیں۔ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔“

سندھیا نے پوچھا۔ ”تمہارے ماں باپ تمہیں پورے کپڑے کیوں نہیں پہناتے؟“

”ہم نہ بچے ہیں نہ پاگل ہیں۔ آبرو کی تلاش میں ہماری یہ حالت ہوئی ہے۔“

آبرو نے چونک کر سلمان کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ”پہلی ملاقات کے بعد سے ہم تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ یہ کامران تو بالکل دیوانہ ہے۔ اس نے تمہاری تصویر بنائی ہے‘ یہ ایک باکمال آرٹسٹ ہے۔“

کامران نے کہا۔ ”آج میں نے ایسٹ لندن میں تمہیں دیکھا تھا۔ ہم وہاں کے اپارٹمنٹ میں گئے تو معلوم ہوا وہاں مس جولی رہتی ہیں۔ ہم ناکام ہو کر واپس آ رہے تھے

کہ کیچڑ میں گر گئے۔ اپنی جیبیں ٹٹول کر دیکھیں تو پتا چلا کہ ساری رقم ہاسٹل میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ ہمارے پاس صرف چار پاؤنڈ تھے۔ اس رقم سے یہی ایک جوڑا ملا۔ ہم نے آدھا آدھا پہن لیا ہے۔ عزت تو ڈھانپ لی ہے۔"

وہ سب ان کی روداد سن رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔ سندھیا نے کہا۔ "آبرو! یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تمہارے سچے عاشق ہیں' ان کے لیے کچھ کرو۔"

آبرو نے پوچھا۔ "ایسی سردی میں ایسے کپڑے پہن کر مجھے تلاش کر رہے ہو۔ مجھ سے ملنا کیوں ضروری تھا؟"

"کل ہم پاکستان جا رہے ہیں۔ سوچا تمہارا پتا اور فون نمبر وغیرہ حاصل کر لیں۔ یہ بھی معلوم کریں کہ تمہاری مستقل رہائش یہاں ہے یا پاکستان میں؟"

آبرو نے پرس میں سے سو پاؤنڈ نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پہلے جا کر گرم لباس اور جوتے وغیرہ خریدو پھر یہاں آکر بات کر لینا۔"

سلمان نے کہا۔ "ہمیں رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاسٹل پہنچتے ہی ہمارا حلیہ بدل جائے گا۔"

"ہاسٹل پہنچنے تک سردی سے بیمار ہو سکتے ہو۔ یہاں قریبی دکان میں جا کر انسان بن جاؤ۔ ایسی حالت میں ہمارے سامنے کھڑے ہو' لوگ دیکھ رہے ہیں۔ تمہارے ساتھ ہمارا بھی مذاق بن رہا ہے۔ یہ رقم لو اور فوراً جاؤ۔"

"کیا ہماری واپسی کا انتظار کرو گی؟ ہم آدھے گھنٹے میں آجائیں گے۔"

"میں انتظار کروں گی اور تمہارے ساتھ ہاسٹل جا کر اپنے سو پاؤنڈ وصول کروں گی۔"

وہ دونوں رقم لے کر چلے گئے۔ آبرو خلا میں تک رہی تھی۔ اسے سلمان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پہلی نظر کی محبت کی قائل نہیں تھی لیکن پہلی بار سمندر کے کنارے اسے دیکھتے ہی دل نے کہا تھا' آئیڈیل ایسے ہی ہوتے ہیں جو پہلی نظر میں دل کو دھڑکا دیتے ہیں اور حواس پر چھا جاتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے کئی بار اسے خیالوں میں دیکھا۔ تصور کی آنکھوں نے اسے دکھایا۔ آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی تو وہی نظر آیا وہ اسے ذہن سے نکالنے کی کوششیں کرتی رہی۔ جولی نے کہا۔ "وہ تو گئے۔ اب ہمیں یہاں سے کھسک جانا چاہیے ورنہ واپس

آکر گلے پڑ جائیں گے۔"

سندھیا نے کہا۔ "تُو نے پہلی ملاقات سے دیکھا ہے۔ وہ دونوں آبرو کے گلے پڑ رہے ہیں۔ وہ ہم میں سے کسی کی طرف دیکھتے بھی نہیں ہیں۔"

پوجا نے پوچھا۔ "کیا خیال ہے آبرو! ان سے پیچھا چھڑاؤ گی۔"

آبرو نے سوچتی ہوئی نظروں سے سہیلیوں کو دیکھا۔ سندھیا نے کہا۔ "اس کا دل آگے پیچھے ہو رہا ہے۔"

جولی نے کہا۔ "یہ سوچ رہی ہے' دونوں میں سے کون زیادہ ہینڈسم ہے؟"

آبرو نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سو پاؤنڈ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ میں ہاسٹل جا کر یہ رقم وصول کروں گی۔"

"کیوں باتیں بنا رہی ہو۔ کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی ہو۔ تمہارے لیے سو پاؤنڈ کیا چیز ہیں۔ وصولی کا تو بس ایک بہانہ ہے۔"

"کچھ بھی سمجھ لو۔ تم سب ظالم سماج تو نہیں ہو کہ تمہارے سامنے عشق کرنے سے ڈروں گی۔ تم سب میرے ساتھ ہاسٹل چلو گی۔"

وہ دونوں بہترین سوٹ میں واپس آئے۔ تھوڑی دیر پہلے جوکر لگ رہے تھے' اب خوب رو اور اسمارٹ دکھائی دے رہے تھے۔ آبرو کا جی چاہتا تھا کہ سلمان کو دیکھتی رہے لیکن وہ نظریں چرانے لگی۔ وہ دونوں میز کے دوسری طرف ٹھیک اس کے سامنے آکر بیٹھ گئے تھے۔ سہیلیوں نے ان کے لیے وہی کرسیاں خالی کی تھیں اور خود دوسری کرسیوں پر بیٹھ گئیں تھیں۔

وہ سب کھانے کا آرڈر دینے لگیں۔ سلمان نے کہا۔ "یہ کھانا ہماری طرف سے ہو گا۔ جو بل بنے گا' وہ ہم ہاسٹل میں جا کر ادا کریں گے۔"

آبرو نے کہا "میں صرف سو پاؤنڈ لوں گی۔ اس سے آگے کچھ نہ کہنا ورنہ ہاسٹل نہیں جاؤں گی اور سو پاؤنڈ بھی نہیں لوں گی۔"

سلمان نے کہا "تم نے اتنی بڑی دھمکی دی ہے کہ میں انکار نہیں کروں گا۔"

کامران نے کہا۔ "جب یہ میری بات نہیں مانتا ہے تو میں بھی اسے ایسی ہی دھمکیاں دیتا ہوں اور یہ سیدھے راستے پر چلا آتا ہے۔"

"تم دونوں دوست ہو؟"

"ہاں' ایسے دوست ہیں کہ بچپن سے ایک دن یا ایک رات کے لیے بھی جدا نہیں رہے۔ ہاسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں۔"

"پاکستان میں کوٹھیاں الگ ہوں گی۔"

"نہیں' ہمارا ایک ہی مکان ہے۔ ایک ہی والدین ہیں۔"

"تو پھر بھائی ہوئے' دوست تو نہ ہوئے۔"

کامران نے کہا۔ "سلمان کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔"

آبرو نے کہا "اوہ۔ سو سیڈ۔"

"میری والدہ اور میرے ننھیال والے جب اسے سوتیلا سمجھتے ہیں اور سوتیلوں جیسا رویہ اختیار کرتے ہیں تو مجھے غصہ آجاتا ہے۔ اس لیے ہم گھر میں بھی دوست بن کر رہتے ہیں۔ جو ہمیں بھائی کہتا ہے' ہم اس سے بات نہیں کرتے۔ بھائی بہت پیارا اور محبت کا رشتہ ہے مگر ہمارے لیے عذاب ہے۔"

آبرو نے کامران کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم بہت سچے اور انصاف پسند ہو ورنہ ایک بھائی دوسرے بھائی سے سب کچھ چھین لینے کے لیے اسے قتل بھی کر دیتا ہے۔"

"اسی لیے ہم بھائی نہیں رہے۔ ہم دوست ہیں اور آخری سانس تک دوست رہیں گے۔"

"پاکستان میں کہاں رہتے ہو؟"

"لاہور میں رہتے تھے۔ ممی نے فون پر بتایا ہے کہ ڈیڈی نے کراچی میں کوئی نئی انڈسٹری لگائی ہے اور وہیں ایک کوٹھی خرید لی ہے۔"

کامران باتیں کر رہا تھا۔ سلمان خاموشی سے آبرو کو دیکھ رہا تھا۔ آبرو اسے نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہی تھی اور اس کی نگاہوں کی آنچ اسے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے وقت مرد سمجھ نہیں پاتے کہ لڑکیاں کب دیکھتی ہیں؟ اور کیسے دیکھنے کے انداز کو چھپا کر انجان بن جاتی ہیں؟

وہ سلمان سے بولی۔ "تم خاموش ہو۔ کچھ بول نہیں رہے ہو۔"

"کامران تمہاری باتوں کے صحیح جوابات دے رہا ہے کہیں غلطی کرے گا تو میں تصحیح کروں گا۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "تمہارے والد کا کیا نام ہے؟"

کامران نے کہا۔ "ہاں اس سے صرف ڈیڈی کا نام پوچھو' وہ سگے ہیں۔ میں ممی کا بتاؤں گا' وہ اس کی سوتیلی ماں ہیں اور میری ممی کا نام ہے حیات بیگم.........."

سلمان نے کہا۔ "اور ہمارے ڈیڈی کا نام ہے چوہدری رحمت علی۔"

وہ دونوں کو گہری سنجیدگی سے دیکھنے لگی پھر اس نے پوچھا۔ "لاہور میں کہاں رہتے ہو؟"

"رہتے تھے۔ ماڈل ٹاؤن میں ہمارے دادا جان حشمت علی بہت بڑی اسٹیل مل کے مالک ہیں۔"

آبرو نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "او.......... اچھا۔"

"کیا تم انہیں جانتی ہو؟"

"انہیں کون نہیں جانتا۔ وہاں کاروباری حلقوں میں سب ہی چوہدری حشمت علی کو جانتے ہیں۔"

"کیا تمہارے ڈیڈی بھی بزنس مین ہیں؟"

"نہیں' جاگیردار ہیں۔ میں ان کی ایک ہی بیٹی ہوں۔ اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے مجھے لندن بھیجا ہے۔"

کامران نے پوچھا۔ "کیا تم پاکستان نہیں جاؤ گی؟"

آبرو نے سلمان کو دیکھا پھر بولی۔ "آؤں گی' ضرور آؤں گی۔"

انہوں نے کھانے سے فارغ ہو کر بل ادا کیا پھر ریستوران سے باہر آکر تھوڑی دور تک پیدل چلتے رہے۔ انہوں نے دور ایک جگہ گاڑی پارک کی تھی۔ وہ اس گاڑی میں بیٹھ کر ہاسٹل آئے۔ جولی نے کہا۔ "آبرو! تم ان کے ساتھ جاؤ۔ ہم یہاں انتظار کریں گے۔"

وہ سب ہنسنے لگیں۔ آبرو ان کے ساتھ ہاسٹل کے کمرے میں آئی۔ ایک طرف ایزل پر اس کی تصویر کا اسکیچ نظر آرہا تھا۔ اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر تیزی سے چلتی ہوئی تصویر کے قریب آئی۔ حیرانی سے بولی۔ "یہ.......... یہ تو میری تصویر ہے۔"

سلمان نے کہا۔ "ہاں' یہ کامران کے فن کا کمال ہے۔ اس نے تمہیں ایک ہی بار سمندر کے کنارے دیکھا تھا۔ تم اندازہ کرو کہ اس کے دل و دماغ پر کس طرح چھا گئی ہو؟"

تمہاری صورت اس کے ذہن میں ایسے نقش ہوگئی ہے کہ اسے تاحیات کوئی مٹا نہیں سکے گا۔"

وہ کامران سے بولی۔ "تم واقعی باکمال ہو۔ کیا میری تصویر میں رنگ بھی بھر سکتے ہو؟"

"ہاں۔ پاکستان جا کر کئی رنگین تصویریں بناؤں گا۔ مجھے اپنا ایڈریس دو۔ وہ تصویریں تمہارے پاس پہنچتی رہیں گی۔"

اس نے لندن کی رہائش گاہ کا پتا اور فون نمبر لکھ کر دیا پھر کہا۔ "ڈیڈی نے لاہور میں نئی زمین خریدی ہے۔ وہاں کوٹھی بنائی جا رہی ہے۔ میں وہاں کا پتا معلوم کرنے کے بعد بتاؤں گی۔"

وہ اس کمرے کو توجہ سے دیکھ رہی تھی پھر اس نے پوچھا۔ "یہاں تم دونوں کے بیڈ الگ ہیں مگر بیڈ شیٹ ایک رنگ اور ایک ڈیزائن کی ہے۔ تمہارے لباس بھی ایک جیسے ہیں۔ اس روز سمندر کے کنارے بھی ایک جیسا لباس پہنے ہوئے تھے۔ دونوں کی میزوں پر ڈائریاں اور کتابیں بھی ایک جیسی ہیں۔"

کامران نے کہا۔ "ہماری زندگی میں سب کچھ ایک جیسا ہے۔ جتنی روٹی سلمان کھاتا ہے اتنی ہی میں بھی کھاتا ہوں۔"

سلمان نے کہا۔ "اگر کبھی یہ آدھی روٹی سے زیادہ نہ کھائے تو میں بھی آدھی کھاتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "تعجب ہے۔ اگر ایک کو مرسڈیز پسند ہو اور دوسرے کو پجیرو تو کیا کرتے ہو؟"

"ایسا تو کبھی نہیں ہوا ہے۔ ہماری پسند ایک ہے' ہماری ضرورت ایک ہے۔"

وہ ذرا دیر سوچتی رہی پھر ہنستی ہوئی بولی۔ "لیکن شادی کے لیے جو لڑکیاں پسند کرو گے' وہ تو الگ الگ ہوں گی۔"

"نہیں۔ لڑکی کے معاملے میں بھی ہماری ایک پسند ہوگی۔ بلکہ ایک پسند ہوگئی ہے۔ ہم دونوں تمہیں دل و جان سے چاہتے ہیں۔"

وہ ایک دم سے چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ سلمان کی میز سے جا کر لگ گئی پھر بولی۔ "یہ کیا مذاق کر رہے ہو؟"

سلمان نے کہا۔ "یہ دیوانہ ہے۔ میرا بھی اور تمہارا بھی۔ یہ کہتا ہے کہ ہم جسے پسند کریں گے' اس کی ایک ہم شکل بہن ہوگی۔"

کامران نے کہا۔ "اور تم بتا چکی ہو کہ اپنے والدین کی ایک ہی اولاد ہو اور تم نے اکلوتی بن کر ہمارے لیے مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔"

وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر سلمان کی ڈائری کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے دو ملاقاتوں میں سمجھ لیا ہے کہ تم دونوں ذہین ہو لیکن کسی ایک پہلو سے ایب نارمل بھی ہو۔ تمہیں اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں سنجیدگی اور ذہانت سے سوچنا' سمجھنا اور فیصلہ کرنا چاہیے۔"

سلمان نے کہا۔ "یہ میرے پیار میں پاگل ہے ورنہ یہ تصویر دیکھ کر تم بھی سمجھ سکتی ہو کہ کس طرح تم اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہو۔ میں چاہتا ہوں' تم اس سے رابطہ رکھو۔ تمہیں رفتہ رفتہ معلوم ہوگا کہ یہ سچا اور صاف گو ہے۔ اس کے دل میں تمہارے لیے جو محبت ہے' وہ سمندر سے زیادہ گہری ہے۔"

کامران نے کہا۔ "صرف میری بات کیوں کر رہا ہے؟ اپنے دل کی بات کیوں نہیں کرتا؟ کیا تُو آبرو کو نہیں چاہتا ہے؟"

وہ بولا۔ "آبرو تو پھر آبرو ہے۔ آبرو سب ہی کو پیاری ہوتی ہے۔"

"تُو باتیں بنا رہا ہے۔"

سلمان نے اس موضوع کو ٹالنے کے لیے پچاس پاؤنڈ نکالے پھر کہا۔ "یہ پچاس میں دے رہا ہوں' باقی تجھے دینا ہے۔"

آبرو نے سلمان سے کہا۔ "میں رقم لینے نہیں آئی ہوں پھر تمہارے پاس بھی رقم نہیں ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ہمارے پاس کافی رقم ہے لیکن تم بھول رہی ہو کہ ہم ہر معاملے میں برابر رہتے ہیں۔ تمہارا قرض اتارنے کے لیے بھی ہم اپنی جیب سے برابر رقم نکال رہے ہیں۔"

دونوں نے برابر رقم نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ وہ بولی۔ "تم دونوں مجھے چاہنے کا دعویٰ کرتے ہو۔ کیا چاہنے والے قرض لیتے اور دیتے ہیں۔ پلیز یہ رقم دے کر میری توہین نہ کرو۔"

انہوں نے رقم واپس رکھ لی۔ آبرو نے کہا۔ "میں کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔ کیا مجھے ملے گا؟"

کامران نے کہا۔ "ہم اپنی پوری زندگی دے دیں گے۔ بولو' کیا چاہتی ہو؟"

"میں اپنی تصویر چاہتی ہوں۔"

کامران نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم نہ مانگتیں تب بھی میں تمہیں دینے والا تھا۔ آج یہ اسکیچ لے جاؤ۔ آئندہ تمہیں رنگین تصویریں ملیں گی۔"

اس نے ایزل سے وہ تصویر اٹھا کر اسے دی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم اسی طرح تصویر بنا کر دوسرے کو دے دیتے ہو؟"

"صرف تمہیں دے رہا ہوں اور دیتا رہوں گا۔ مجھے تمہاری تصویروں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم میرے ذہن پر اس طرح نقش ہو کہ دن رات نگاہوں کے سامنے رہتی ہو۔"

آبرو نے ہچکچاتے ہوئے سلمان کو دیکھا۔ سلمان نے نظریں جھکا لیں پھر کہا۔ "چلو' ہم تمہیں باہر تک چھوڑ آئیں۔"

"پلیز' یہ تکلیف نہ کرو۔ میں یہاں سے تنہا جاؤں گی۔"

"ہمارے ساتھ جانے میں کیا اعتراض ہے؟"

وہ بولی۔ "ایک مرد دو عورتوں کے ساتھ چل سکتا ہے ایک شریف عورت صرف اپنے مرد کے ساتھ چلتی ہے۔ میں چاہتی ہوں' میرے جانے کے بعد تم دونوں یہاں بیٹھ کر میری بات پر غور کرو۔"

وہ اپنی تصویر لے کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

کامران نے کہا۔ "یار! یہ کیا بات ہوئی؟"

وہ قریب آ کر بولا۔ "آسانی سے سمجھنے والی بات سمجھ میں نہ آئے تو اسے بھی سمجھا پڑتا ہے۔ وہ ہم دونوں کے ساتھ کیوں نہیں گئی؟ اس پر اُس نے غور کرنے کے لیے کہا ہے۔ میں تو پہلے ہی غور کر چکا ہوں۔" وہ اپنی ایک انگلی اس کی پیشانی پر ٹھونکتے ہوئے بولا "مگر تیری کھوپڑی میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ ایک شریف لڑکی لندن کے ماحول میں بھی دو بوائے فرینڈ بنائے گی تو نیک نام نہیں رہے گی۔ جبکہ ایک مشرقی لڑکی ایک بوائے فرینڈ کا بھی تصور نہیں کرتی ہے۔ وہ صرف ایک جیون ساتھی کی تمنا کرتی ہے۔"

کامران نے کہا۔ "میری جان! اس میں غور کرنے کی کون سی بات ہے' تو اس سے شادی کرے گا۔ وہ تیری شریکِ حیات بن کر رہے گی۔"

"فضول باتیں نہ کر۔ تو اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ وہ تیری شریکِ حیات بنے گی۔"

"کیا تو اسے دل و جان سے نہیں چاہتا ہے؟ دیکھ جھوٹ نہ بولنا۔ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر' میری قسم کھا کر سچ کہہ دے۔"

وہ سلمان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھنے لگا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بولا۔ "تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں قسمیں نہیں کھاتا۔ صاف اور سیدھی بات کرنے والے کو قسم کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی اور سیدھی سی بات یہ ہے کہ تیری پسند میری پسند اور تیری ضرورت میری ضرورت کے اصول کے مطابق میں نے تیری پسند کو اپنی پسند بنا لیا ہے۔ اس سے عشق نہیں کیا ہے۔ میں تیری طرح اس کا دیوانہ نہیں بن سکتا کیونکہ میں تیری طرح رومان پسند مصور نہیں ہوں۔ خیالوں کی دنیا میں نہیں رہتا۔ اتنی بڑی جیتی جاگتی دنیا میں اپنا ایک اچھا مستقبل بنانے کے لیے اور ایک اچھا مقام حاصل کرنے کے لیے میں خیالوں میں نہیں رہ سکتا۔ کسی کے عشق میں قیمتی لمحات ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ کامیابی کی منزل پر پہنچنے کے بعد ایک آبرو نہیں' آبرو جیسی درجنوں لڑکیاں مل جائیں گی۔"

"تیرے عزائم بہت بلند ہیں۔ ہم تو ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر چلتے آئے ہیں۔ لہٰذا میں بھی تیرے ساتھ شاندار مستقبل کی طرف بڑھتا رہوں گا۔ برس' دو برس یا دس برس گزر جائیں' کوئی بات نہیں۔ اس وقت تک آبرو پرائی ہو چکی ہو گی۔ آج جو مسئلہ ہے وہ کل خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

وہ اپنی بات ختم کر کے تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ یہ بات ایسی نہیں تھی کہ آسانی سے ختم ہو جاتی۔ دل کی بات ہو تو وہ بات دھڑکن بن جاتی ہے اور دھڑک دھڑک کر زندگی کے ساتھ چلتی ہے۔

وہ سوچتا ہوا اپنی میز کے پاس آیا۔ سوچ یہ تھی کہ کامران اس کی خاطر آبرو کو نظر انداز کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ لہٰذا وہ بھی اسے نظر انداز کرے گا۔ یہ اچھا موقع ہے۔ وہ آبرو سے دور جا رہے ہیں۔ اس سے دور ہونے کے بعد وہ دوسرے معاملات میں مصروف رہ کر اسے بھلا سکیں گے۔

وہ کتابیں اور کاپیاں اٹھا کر ایک طرف رکھنے لگا تاکہ انہیں اٹیچی میں رکھ دے۔ ایسے وقت ڈائری نظر نہیں آئی۔ وہ اسے تلاش کرنے لگا۔ جب آبرو کمرے میں آئی تھی تو ڈائری میز پر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے کامران کی میز پر آکر دیکھا۔ وہاں کامران کی ڈائری تھی۔ اس کی نہیں تھی۔

وہ یاد کرنے لگا۔ آبرو بڑی دیر تک اس کی میز کے پاس کھڑی رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا' باتوں کے دوران میں اس کی کتابیں دیکھ رہی ہے لیکن شاید ڈائری پر اس کی نظر تھی اور شاید وہی اس ڈائری کو پرس میں رکھ کر لے گئی ہوگی۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ وہ اسے بڑی چاہت سے دیکھتی ہے۔ گفتگو کے دوران میں کامران سے زیادہ اسے مخاطب کرتی ہے اور اب تو اس کی ڈائری چرا کر لے گئی ہے۔ ڈائری کیا ہوتی ہے؟ دل کی بھیدی ہوتی ہے اور وہ بھیدی دل کی لنکا ڈھانے والی تھی۔

وہ دوسرے دن ائیرپورٹ پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ آبرو ان سے پہلے وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ اس کی ایک سہیلی سندھیا اس کے ساتھ تھی۔ وہ قریب آتے ہوئے بولی۔ "ہائے! تم دونوں نے مجھ سے نہیں کہا کہ میں تمہیں سی آف کرنے آؤں۔ دیکھو' میں خود ہی آگئی ہوں۔"

سلمان نے کہا۔ "ہم نے سوچا' تمہیں اتنی دور بلائیں گے۔ خواہ مخواہ زحمت دینا اچھی بات نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "جو بات دوسروں کے لیے زحمت ہوتی ہے' اپنوں کے لیے رحمت بن جاتی ہے۔ کیا میرے آنے پر اعتراض ہے؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو؟ تمہارے آنے سے ہم حیران بھی ہیں اور خوش بھی۔"

کامران نے کہا۔ "دو گھنٹے بعد فلائٹ جائے گی۔ تمہارے ساتھ اچھا وقت گزر جائے گا۔ سلمان' تُو آبرو سے باتیں کر۔ میں اپنے اور تیرے لیے میگزین خرید کر ابھی آتا ہوں۔"

سندھیا نے کہا۔ "میں بھی ایک میگزین خریدنا چاہتی ہوں۔ آؤ ہم چلیں۔"

وہ بک اسٹال کی طرف جانے لگے۔ آبرو نے کہا۔ "میں خاص طور پر سندھیا کو ساتھ لائی تھی تاکہ وہ کامران کو کسی بہانے اپنے ساتھ کہیں لے جائے ہمیں کچھ باتیں کرنے کا موقع مل جائے لیکن کامران خود ہی چلا گیا۔"

وہ انجان بن کر بولا۔ "ایسی کیا باتیں ہیں کہ ہم کامران کی موجودگی میں نہیں کر سکتے؟"

"بہت ساری باتیں ہیں۔ اتنی ساری کہ باتیں کرتے کرتے زندگی چھوٹی پڑ جائے۔"

"ہم ساری زندگی کامران کے سامنے بھی باتیں کر سکتے ہیں۔ میں کبھی اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا ہوں۔"

"جھوٹ نہ کہنا۔ کیا تم نے اسے بتایا ہے کہ تمہاری ڈائری چوری ہو گئی ہے؟"

وہ خاموش رہا' جواب نہ دے سکا۔ وہ بولی۔ "تم نے اس لیے نہیں بتایا کہ تم نے چوری کرنے والی کو سمجھ لیا تھا۔"

"تمہیں اس طرح ڈائری نہیں لے جانا چاہیے تھی۔"

"ہاں۔ یہ خلافِ تہذیب ہے کہ کسی کا خط یا ڈائری پڑھی جائے لیکن اس ڈائری میں ایک جگہ میرا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس پر سرسری سی نظر ڈالی تو اس میں اپنا ذکر بھی نظر آیا پھر تو میں اس ڈائری کو لے جانے اور پڑھنے کی حق دار ہو گئی۔"

وہ اس سے نظریں چرانے لگا۔ وہ بولی۔ "تم نے جو باتیں لکھ دی ہیں' وہ باتیں شاید زندگی بھر مجھ سے کہہ نہ پاتے۔"

"پلیز آبرو! وہ ڈائری مجھے واپس دے دو۔"

اس نے پرس کھول کر ڈائری نکالی اور پھر اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ اسے لینا چاہتا تھا پھر ٹھٹک کر بولا۔ "یہ میری نہیں ہے۔"

"میری ہے اور تم اسے پڑھنے کے حق دار ہو کیونکہ اس میں تمہارا ذکر ہے۔ میں تمام رات جاگ کر لکھتی رہی اور اس قدر لکھتی رہی کہ رات ختم ہو گئی۔ بات ختم نہیں ہوئی۔ آدھی ڈائری کے اوراق سادہ رہ گئے۔"

وہ بڑی چاہت سے ڈائری کو دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "اب تمہارے اندر وہ تجسس بھڑک رہا ہے کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ تم اسے پڑھے بغیر نہیں رہ سکو گے۔ میری یہ ڈائری ضرور لو گے۔"

اس نے وہ ڈائری لے لی اور پھر اپنے شانے سے لٹکے ہوئے بیگ میں اسے چھپا لیا "میں کل صبح تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔ جب تک تمہاری آواز نہیں سنوں گی' فون کے پاس بیٹھی رہوں گی۔"

"صرف میں تم سے باتیں نہیں کروں گا۔ وعدہ کرو، تم کامران سے بھی باتیں کرو گی۔"

"ہاں۔ میں کامران کو ایک بہت اچھا انسان، بہت اچھا دوست سمجھتی ہوں۔ اس سے ضرور باتیں کروں گی۔"

وہ پرس سے ایک لفافہ نکال کر دکھاتے ہوئے بولی۔ "میں نے تم دونوں کے نام ایک خط لکھا ہے۔ اسے سفر کے دوران میں پڑھ لینا۔"

"پتا نہیں۔ تم نے کیا لکھا ہے۔ ہم دوستوں میں بچپن سے توازن قائم ہے۔ مجھے ڈر ہے، اس خط سے وہ توازن بگڑ نہ جائے۔"

"فکر نہ کرو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔"

سندھیا اور کامران آگئے۔ سندھیا نے کہا۔ "مسٹر کامران بھی کمال کرتے ہیں۔ ایک ہی جیسے دو رسالے خریدے ہیں جبکہ ایک رسالہ دونوں پڑھ سکتے ہیں۔"

سلمان نے کہا۔ "بچپن میں ایک ہی کھلونے سے ہم دونوں کھیل سکتے تھے لیکن یہ ضد کرتا تھا کہ میرے لیے بھی ویسا ہی دوسرا کھلونا لایا جائے۔ یہ کبھی وہ چیز اپنے لیے پسند نہیں کرے گا جو مجھے نہ مل سکے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے آبرو کو دیکھا پھر کہا۔ "میں بھی اپنے لیے ایسی کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتا، جو کامران کو نہ ملے۔"

آبرو نے بات کو سمجھتے ہوئے سر جھکا لیا۔ اسپیکر کے ذریعے اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ کامران نے کہا۔ "ہمیں چلنا چاہیے۔"

آبرو نے وہ لفافہ کامران کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تم دونوں کے نام یہ خط لکھا ہے۔ جہاز میں آرام سے بیٹھنے کے بعد پڑھ لینا۔"

کامران نے لفافہ لے کر کہا۔ "ہم دونوں کے لیے ہر چیز الگ الگ ہوتی ہے مگر ایک جیسی ہوتی ہے اور انصاف کے مطابق برابر ہوتی ہے۔ تم نے ایک لفافہ مجھے دیا ہے۔ دوسرا لفافہ سلمان کو دینا چاہیے۔"

"مجھے یاد نہیں رہا ورنہ دو خط لکھ کر دو الگ الگ لفافوں میں رکھ کر لے آتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ جب چیز ایک ہی ہو تو ہم اسے آپس میں برابر بانٹ لیتے ہیں۔"

اس نے لفافے کو ٹھیک درمیان سے پھاڑ کر اس کے دو برابر ٹکڑے کیے پھر آدھا

حصہ سلمان کو دے کر آدھا اپنی جیب میں رکھ لیا۔

آبرو نے کہا۔ "تم نے میرے سامنے میرے خط کو پھاڑ ڈالا۔ اس طرح میری توہین نہیں کر رہے ہو؟"

کامران نے عاجزی سے کہا۔ "پلیز، اس پہلو پر نہ سوچو۔ خط کو پھاڑا نہیں گیا۔ اس کے دو حصے کیے گئے ہیں۔ ہم پڑھنے سے پہلے دونوں حصوں کو ملائیں گے، اسے پڑھیں گے پھر اپنا اپنا حصہ اپنے پاس رکھیں گے۔ اس پہلو سے سوچو کہ تمہارا خط دونوں کے پاس رہے گا۔"

وہ مسکرانے لگی۔ وہ دونوں اس سے رخصت ہو کر بورڈنگ کارڈز لے کر طیارے میں آگئے۔ جب طیارے نے پرواز کی تو بلندی پر پہنچنے کے بعد انہوں نے سیٹ بیلٹ کو کھولا پھر اپنے آدھے آدھے لفافے نکال کر اس میں سے آدھا آدھا خط نکالا پھر ایک دوسرے کے قریب جھک کر دونوں ٹکڑوں کو ملا کر پڑھنے لگے۔ آبرو نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"اے آسمان سے اتری ہوئی جڑواں روحو!

تم دونوں کو مخاطب کرنے کے لیے پہلے کس کا نام لکھوں؟ ایک نام پہلے لکھوں گی تو دوسرے کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم دونوں میں سے کسی کو مجھ سے شکایت ہو۔ یہ الزام نہیں لینا چاہتی کہ ایک عورت کے آنے سے دوستی کے آئینے میں بال آجاتا ہے۔

تم دونوں سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ اللہ جانتا ہے کہ آئندہ کوئی رشتہ ہو سکے گا یا نہیں؟ اور اگر ہوگا تو کیسے ہوگا جبکہ ایک انار اور دو بیمار ہیں۔

ویسے اللہ نے سوچنے اور سمجھنے کے لیے مجھے جتنی عقل دی ہے اس سے یہی ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ دوستی اور محبت دونوں سے ہو سکتی ہے لیکن عشق کسی ایک سے ہی ہو سکتا ہے۔

یہ پرانی کہاوت ہے کہ عشق کیا نہیں جاتا، ہو جاتا ہے۔ یہ لاٹری نہیں ہے کہ کسی کے نام سے نکل آئے اور کہا جائے کہ جاؤ، اس خوش نصیب کے نام ہو جاؤ۔ عشق سو طرح کی آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے لیکن ایسا دھکا نہیں دیتا، جیسا کہ تم دونوں مجھے ایک دوسرے کی طرف دے رہے ہو۔

سوچو! مجھے پیار دے رہے ہو یا ظلم کر رہے ہو؟
کم سے کم عقل والے بھی اپنی آبرو کو سنبھال کر رکھتے ہیں۔ پلیز' آبرو کو تماشا نہ بناؤ۔

فقط تمہاری اور تمہاری آبرو۔"

انہوں نے خط کو دوسری بار پڑھا پھر تیسری بار پڑھا پھر اپنا اپنا آدھا حصہ تہہ کر کے اپنی اپنی جیب میں رکھ لیا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر خلا میں تکنے لگے۔ بڑی دیر تک خاموش رہے اور سوچتے رہے پھر کامران نے کہا۔ "میں سمجھ رہا تھا' یہ ہم دونوں کا معاملہ ہے۔ اسے دل سے زیادہ نہیں لگائیں گے۔ پاکستان جا کر بھولنے کی کوشش کریں گے۔"

سلمان نے پوچھا۔ "کیا تو اسے بھول سکے گا؟"

"یار! اب یہ صرف میرا اور تیرا معاملہ نہیں رہا ہے' وہ تیسری بھی گرفتار ہو گئی ہے۔ ہم میں سے کسی کو چاہتی ہے۔"

"اور وہ کبھی ظاہر نہیں کرے گی کہ ہم میں سے کسے چاہتی ہے۔ اس نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ وہ ہماری دوستی کے آئینے میں بال نہیں آنے دے گی۔"

"اس طرح وہ دل کی بات دل میں رکھے گی اور ہم سے صرف دوستی کرے گی۔"

"ہماری تہذیب کسی لڑکی کو دوستی کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ چھپ کر دوستی رکھنا چاہے گی تو کب تک رکھے گی؟"

"صرف فون کے ذریعے دوستی رہ سکتی ہے۔ ہم پاکستان پہنچ کر اسے فون پر سمجھائیں گے۔"

"بہتر یہ ہو گا کہ ہم تینوں اپنے آپ کو سمجھاتے رہیں۔"

وہ خاموش ہو گئے۔ کہنے کے لیے بہت کچھ تھا مگر کہنے سے بات نہیں بنا کرتی۔ سوچنے کے لیے بھی بہت کچھ تھا لیکن سوچتے رہنے سے ساحل کبھی نہیں ملتا۔

تھوڑی دیر بعد کامران مسکرانے لگا پھر ہنسنے لگا۔ سلمان نے پوچھا۔ "کس بات پر ہنس رہا ہے؟"

"اپنی حالت پر ہنسی آ رہی ہے۔ ہم پہلے کبھی اتنے سنجیدہ اور فکر مند نہیں رہے تھے۔ دیکھ یار! ہم ایسا عشق کریں گے جو ہمیں بیمار نہ بنائے۔ ہم مسائل کو دعوت نہیں دیں گے۔ مسائل سے کترا کر لائف انجوائے کریں گے۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے۔ واقعی ہم کل سے مسکرانا اور قہقہے لگانا بھول گئے ہیں۔"

"تو پھر ہمیں سب کچھ بھول کر سفر کو خوش گوار بنانا چاہیے۔ پیچھے ایک سیٹ پر ایک حسین لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ تنہا ہے۔ میں اس سے دوستی کرنے جا رہا ہوں۔ اب تو سوچ لے کہ تجھے کیا کرنا ہے۔ کیونکہ دوستی ہو گئی تو میں وہاں دیر تک بیٹھا رہوں گا۔"

وہ اٹھ کر جانے لگا۔ سلمان نے سیٹ پر سے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ مسافروں کے درمیان ہر عمر کی عورتیں تھیں۔ ان میں سے کچھ تنہا بھی تھیں۔ کامران ایک لڑکی کے پاس جا کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر ساتھ والی سیٹ پر گئی۔ کامران اس کی خالی کی ہوئی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ شاید تنہائی سے بور ہو رہی تھی۔ کامران کی موجودگی سے خوش ہو کر اس سے باتیں کرنے لگی تھی۔

سلمان کو اطمینان ہوا کہ اب وہ ادھر نہیں آئے گا۔ اس نے اپنے بیگ میں سے وہ ڈائری نکالی۔ ڈائری کو ہاتھ لگاتے ہی ایسا لگا جیسے آبرو کو چھو رہا ہو۔ اس کا خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں عجیب سی ہو جاتی تھیں جیسے دل دھڑک نہ رہا ہو' مچل رہا ہو۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا۔ پہلے صفحے پر جلی حروف سے سلمان لکھا ہوا تھا اور سلمان کے نون کے نقطے کی جگہ چھوٹا سا دل بنا ہوا تھا۔ وہ اوراق پلٹنے لگا۔ جس صفحے سے اس کی تحریر شروع ہوئی تھی' وہاں سے پڑھنے لگا۔ اس نے لکھا تھا۔

"سلمان! ہم تہذیب اور شائستگی کو سمجھتے ہیں اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی اس کے برعکس ہم سے کوئی حرکت سرزد ہو جاتی ہے میں نے نادانستگی میں تمہاری ڈائری کو ہاتھ لگایا جبکہ اسے ہاتھ نہیں لگانا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے چھونے سے میرا دل تیزی سے یوں دھڑکنے لگا جیسے میں تمہیں چھو رہی ہوں۔ میں نے بے اختیار اسے کھولا تو پہلے صفحے پر اپنا نام دیکھ کر چونک گئی۔

"تمہارے ہاتھ سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن اس ہاتھ نے میرا نام لکھ کر ایک نامعلوم سے رشتے کی ابتدا کی تھی۔ اب مجھے اس ڈائری کو کھول کر دیکھنے اور پڑھنے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ میں نے یونہی سرسری طور پر ایک آدھ صفحے پر نظر ڈالی' وہاں میرا ذکر تھا۔ تجسس میں مبتلا ہو گئی کہ پتا نہیں میرے بارے میں کیا کچھ لکھا گیا ہے؟ اس لیے میں اسے چرا کر لے آئی ہوں اور میں اس چوری پر شرمندہ نہیں ہوں۔

"تم نے ابتدائی صفحات میں اپنے اور میرے بارے میں جن جذبوں کو لفظوں میں

ڈھالا ہے' انہیں پڑھ کر یوں لگا جیسے تم میرے اندر جھانک رہے ہو اور میں تمہارے اندر دیکھ رہی ہوں اور یہ ڈائری نہیں ایک دریچہ ہے۔ اس کھلے ہوئے دریچے سے ہم ایک دوسرے کو صاف طور سے دیکھ رہے ہیں۔

"پھر تم نے آگے چل کر کامران کا ذکر کیا۔ یہ پتا چلا کہ وہ مجھے دیوانہ وار چاہتا ہے۔ مجھے خوابوں اور خیالوں میں دیکھتا ہے۔ اس کے مشاہدے میں سمندر جیسی گہرائی ہے۔ تخیل میں اتنی شدت ہے کہ مجھے سراپا اپنے سامنے دیکھ کر میری تصویر بنا لیتا ہے اور واقعی اس نے مجھے ایک بار دیکھ کر میری تصویر بنائی ہے۔ وہ ایک باکمال مصور ہے' میرا عاشق ہے' دیوانہ ہے لیکن کوئی دیوانہ ہو تو اس کی دیوانگی کا جواب دیوانگی سے دینا لازمی نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس عاشق کی قدر کی جائے اور اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے بغیر اسے یہ سمجھنے کا موقع دیا جائے کہ عشق اپنا صلہ نہیں چاہتا۔ اسے دوسری طرف سے کچھ ملے گا یا نہیں؟ اور اکثر کچھ نہیں ملتا۔ عاشق وہ ہے جس کے ہاتھ میں کشکول نہیں ہوتا۔

"میں نہیں جانتی کہ یہ حقیقت کس حد تک کامران کی سمجھ میں آئے گی لیکن میری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ تم میری محبت اور اس کی دوستی کے دوراہے پر کھڑے ہو گئے ہو۔

"تم نے لکھا ہے کہ میں تمہارے دل میں پتھر کی لکیر بن گئی ہوں۔ اسے کوئی مٹا نہیں سکے گا اور کامران سے تم ایسی دوستی کرتے ہو جیسے عبادت کر رہے ہو۔ میں تمہاری دلی اور دماغی حالت کو خوب سمجھ رہی ہوں۔

"تم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کبھی ہماری روبرو ملاقات ہو گی اور میں تمہاری طرف مائل ہونے لگوں گی تو تم مجھے کامران کی طرف مائل کرو گے۔ اگر میں مائل نہ ہوئی تو مجھ سے التجا کرو گے کہ میں کبھی اس کے دل کو ٹھیس نہ پہنچاؤں۔ کبھی اسے احساس نہ ہونے دوں کہ میں نے اسے کمتر اور پرایا سمجھا ہے۔

"یہ میرے لیے بڑی آزمائش کی بات ہو گی۔ یہ ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ دو میں سے کسی ایک کو پسند کیا جائے تو دوسرا ایک ذرا سا غیر اہم ہو جاتا ہے۔

"تم دونوں کی چاہت میں ایک ایسا مقام آئے گا' جب ایک حاصل کرے گا اور دوسرا محروم رہے گا۔ اس بازی میں کسی ایک ہی کو جیتنا ہے۔ تم دونوں میں اتنی شدید اور گہری دوستی ہے کہ میں واقعی کسی ایک کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔ کامران

تمہارے لیے بڑی قربانیاں دیتا آرہا ہے۔ وہ ایک سوتیلا بن کر تم سے بہت کچھ چھین سکتا تھا۔ میں تم پر یہ الزام نہیں آنے دوں گی کہ تم نے مجھے اس سے چھین لیا ہے۔

"تم ایک دوسرے سے دوستی کرتے ہو اور مجھ سے عشق کر رہے ہو۔ ہم تینوں عشق یا دوستی کے سنگم پر ہیں۔ دوستی ایسی چٹان ہوتی ہے کہ ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے مگر کبھی جھکتی نہیں اور عشق جھکتا ہے اور فنا ہوتے ہوتے سربلند ہو جاتا ہے۔

"پتا نہیں دوستی ٹوٹ کر بکھر جائے گی یا عشق فنا کے مقام پر سربلند ہو گا۔ اللہ بہتر جانتا ہے' کیا ہونے والا ہے............"

وہ ڈائری کا ایک ایک ورق الٹ کر پڑھتا جا رہا تھا۔ آگے بھی اس نے بہت کچھ لکھا تھا لیکن اس کا لبِ لباب یہی تھا کہ وہ تینوں عشق اور دوستی کے سنگم پر پہنچ کر سوالیہ نشان بن گئے تھے۔

اس نے پڑھنے کے دوران سر گھما کر دیکھا۔ کامران نظر نہیں آیا۔ وہ لڑکی سیٹ پر پشت سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ سلمان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دور تک نظریں دوڑائیں۔ جہاز کی آخری چند سیٹیں خالی تھیں۔ کامران ان میں سے ایک خالی سیٹ پر بیٹھا اپنے ساتھ والی خالی سیٹ کو اتنی محویت سے دیکھ رہا تھا جیسے اپنے پاس بیٹھی ہوئی کسی ہستی کو دیکھ رہا ہو۔

سلمان اس کی عادتوں کو بچپن سے سمجھتا آرہا تھا۔ اس وقت وہ خیالوں کی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ سلمان اسے سمجھاتا تھا۔ "مصور یا تخلیق کار ہونا اچھا ہے لیکن وقت بے وقت تخیل کی بیماری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔"

"یار! تخیل سے میری تخلیقی قوت بڑھتی ہے اور تُو اسے بیماری کہتا ہے؟"

"جو عادت حد سے بڑھ جائے' وہ بیماری بن جاتی ہے۔"

"تُو نے دیکھا ہے کہ میری تصویروں میں کتنی جان پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تخیل کا کرشمہ ہے۔"

اس کا یہ دعویٰ کم از کم آبرو کے سلسلے میں درست تھا کہ وہ جب بھی اسے خیالوں میں پکارتا تھا' وہ گویا اس کی نگاہوں کے سامنے مجسم چلی آتی تھی اور یہ شاید اس لیے تھا کہ تخیل کی وسیع کائنات میں دیکھنے کے لئے اور کوئی نہیں رہا تھا۔ صرف ایک وہی رہ گئی تھی۔

اور اس وقت جہاز کی آخری سیٹ پر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے کہہ رہی تھی۔ "میں تو تمہارے دستِ طلب میں ہوں۔ تمہارے تخیل کی شہزادی ہوں۔ تمہاری تنہائی کی ساتھی ہوں۔ تم نے پکارا' میں چلی آئی۔"

وہ بولا۔ "آدمی تنہا جی نہیں سکتا۔ اسے ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا ساتھی جو حسین ہو' دل نشیں ہو اور اداؤں سے بھرپور ہو۔ سلمان جیسے دوست کے باوجود تم میرے لیے ضروری ہو کیونکہ میں مصور ہوں۔ حسن اور شاعری سے میرے اندر تحریک پیدا ہوتی ہے اور تمہارے جیسی دلربا کے باوجود سلمان میرے لیے ضروری ہے کیونکہ وہ صرف دوست نہیں ہے' میری زندگی کے لیے آکسیجن ہے۔"

"تم اس قدر اسے کیوں چاہتے ہو؟"

"ہم اس کی وضاحت نہیں کر سکتے کہ ہم کسی کو کیوں چاہتے ہیں؟ اور کوئی ہمیں اچھا کیوں لگتا ہے؟ تمہارے جیسی حسین لڑکیاں دنیا میں بہت ہیں لیکن میں صرف تمہیں کیوں چاہتا ہوں اور صرف سلمان کو کیوں چاہتا ہوں؟ یہ کون بتائے؟ چاہت آپ ہی آپ دل میں پیدا ہوتی ہے۔"

"میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ وہ سوتیلا ہے اور سوتیلے سے محبت نہیں ہوتی۔"

"اگر وہ میری ممی کے سائے میں پرورش پاتا تو میں اپنی ممی کا سوتیلا رویہ دیکھ کر ایک روایتی سوتیلا بھائی بن جاتا لیکن میری پیدائش کے بعد ممی بیمار رہنے لگیں۔ میں نے اور سلمان نے پانچ برس تک پھوپی کے سائے میں پرورش پائی پھر دادا جان نے ہمیں لندن میں تعلیم کے لیے بھیج دیا۔ تب سے اب تک ہم مختلف اسکولوں اور ہاسٹلوں میں رہتے رہے۔ ہم سال میں ایک یا دو بار پاکستان جا کر اپنے والدین اور عزیز و اقارب سے ملتے تھے ورنہ لندن جیسے بڑے شہر میں ہم دونوں دن رات ساتھ رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کام کرتے تھے۔

"کبھی کبھی ممی سے اور ماموں سے مل کر پتا چلتا تھا کہ سوتیلا پن کیا ہوتا ہے اور وہ کس طرح سلمان سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ میرے اندر بھی نفرت پیدا کرنے کی باتیں کرتے تھے لیکن مجھے لندن میں سلمان کی محبت اور توجہ زیادہ ملتی رہی۔ جیسے جیسے شعور

میں پختگی آئی' یہ بات ذہن میں نقش ہوتی گئی کہ میں ہر بات اور ہر معاملے میں سلمان کو اپنے برابر مقام نہیں دوں گا تو ایک دن دولت اور جائداد کی تقسیم میں سلمان کے ساتھ ناانصافی ضرور ہوگی۔

"کوئی سا بھی رسالہ خرید کر ہم دونوں اسے پڑھ سکتے ہیں لیکن میں ویسا ہی دوسرا رسالہ سلمان کے لیے خریدتا ہوں تاکہ جو بھی ضروری اور غیر ضروری چیزیں خریدی جائیں' وہ صرف میرے لیے نہیں' سلمان کے لیے بھی خریدی جائیں۔ ہم ایک رنگ اور ڈیزائن کے لباس پہنتے ہیں اور کھانے کے لیے ایک جیسی ڈشیں پسند کرتے ہیں۔ میری ممی' ماموں اور دوسرے ننھیال والے مجھے خبطی اور احمق سمجھتے ہیں لیکن ایسی حرکتوں سے میں نے انہیں باور کرا دیا ہے کہ وہ سلمان سے لاکھ نفرت کرنے کے باوجود اس سے ناانصافی نہیں کر سکیں گے۔"

"تم بہت عظیم ہو۔ تم نے سوتیلے کو سگے سے زیادہ محبت اور عزت دی ہے۔ ایک ہی جیسی دو چیزیں تم دونوں کو ملتی رہیں گی۔ دولت اور جائداد ایک طرح تقسیم ہوگی لیکن میرا کیا بنے گا؟ میرے جیسی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ میں ایک ہوں اور یہ تقسیم نہیں ہو سکتی۔"

"یہ تخلیق کار کا کمال ہے کہ وہ ایک جیسی دوسری پیدا کر لیتا ہے۔ اپنے تصور میں اور تصویر میں ہو بہو وہی ہوتی ہے جیسی تم ابھی میرے سامنے ہو اور ہمیشہ میری تنہائیوں میں رہا کرو گی۔"

"لیکن میں تو ایک خیال ہوں۔ ایک بہلاوا ہوں۔"

"تم خیال کی سچائی ہو۔ وہ آبرو جو سلمان سے ملنے ائرپورٹ آئی تھی وہ ایک جسم ہے اور تم روح ہو۔ وہ جسم بیمار ہو سکتا ہے' تم نہیں ہو سکتیں۔ وہ جسم بوڑھا ہو سکتا ہے' تم ہمیشہ جوان رہو گی۔ جسم مرجھاتا ہے اور فنا ہوتا ہے' تم کبھی زوال کی طرف نہیں جاؤ گی۔"

"لیکن عورت کا بدن حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔"

"عورت مرجائے تو اس کا بدن قبرستان کے کچرا گھر میں پھینک دیا جاتا ہے۔"

"مرد کے جسم کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے لیکن جب تک زندگی رہتی ہے' ایک دوسرے کے حصول کی تمنا مچلتی رہتی ہے۔"

"تم نے نہیں سمجھو گی۔ شاعر' سنگتراش اور مصور جیسے تخلیق کار بسم لو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ اولیت خیال کی ہے۔ تخیل کے آسمان سے جو ہستی ان کی نگاہوں کے سامنے آتی ہے' وہی ان کی زندگی بھر کی فنکارانہ کمائی ہوتی ہے۔ میں فن کماتا ہوں۔ عورت کمانے والے اور ہوتے ہیں۔"

وہ خاموش رہی۔ وہ اسے پیار سے اور ایک فاتح کے فخر سے دیکھنے لگا۔ اُس نے اس طرح اسے فتح کیا تھا کہ وہ کبھی اس کی دسترس سے باہر نہیں رہتی۔ کسی روک ٹوک کے بغیر دن رات کے کسی بھی لمحے میں اس کے پاس آسکتی تھی۔

وہ بولی۔ "جب دو دریا ایک مقام پر آکر ملتے ہیں تو اس جگہ کو سنگم کہتے ہیں۔ اس سنگم کے بعد ایک ہی دریا بہتا ہے کیونکہ دو مل کر ایک ہو چکے ہوتے ہیں۔ آج تم عشق اور دوستی کے سنگم پر ہو۔ اس کے بعد جو دریا بہے گا' وہ دوستی کا ہو گا یا عشق کا؟ کسی ایک کو آگے جانا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہماری دنیا میں جتنی نیکیاں اور مہربانیاں کی جاتی ہیں' ان کے پیچھے کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم دوستی کے نام پر سلمان سے جتنی نیکیاں کر رہے ہو' اس کے پیچھے خود غرضی پوشیدہ ہے؟"

"ہاں' میں تم سے صاف اور سیدھی بات کر رہا ہوں کیونکہ تم میری تخلیقی قوت ہو۔ میری راز دار ہو۔ بات یہ ہے کہ جو بات اٹل ہوتی ہے' وہ اٹل ہی رہتی ہے' وہ بدلتی نہیں ہے۔ سوتیلا پن ایک اٹل حقیقت ہے۔ یہ حقیقت بدل نہیں سکتی۔ سوتیلا کبھی سگا ہو بھی نہیں سکتا۔"

"لیکن تم اسے سوتیلا بھائی نہیں سمجھتے ہو۔"

"نہ سمجھنے سے وہ سگا تو نہیں ہو جائے گا۔ دو سوتیلوں کے درمیان ہمیشہ یہ جنگ جاری رہتی ہے کہ کون کسے مات دے کر اس سے سب کچھ چھین لے گا۔ چھین لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ایک کتا دوسرے کتے سے روٹی چھین لیتا ہے۔ مات دینا بڑی بات ہے اور میں اسے بہت بڑی مات دوں گا۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ سلمان ڈائری پڑھنے کے دوران میں رک گیا۔ اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ جہاز کے پچھلے حصے میں چند سیٹیں خالی تھیں۔

وہاں ایک سیٹ پر کامران بیٹھا اپنی ساتھ والی سیٹ کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ وہاں بیٹھی ہوئی ہو۔ اس سے کچھ کہہ رہی ہو اور اس کی کچھ سن رہی ہو۔

☆======☆======☆

چوہدری رحمت علی اپنی تاحیات بیگم اور سالے قادر جان کے ساتھ ائرپورٹ آیا تھا۔ دونوں بیٹے ایک مدت کے بعد ان کے ساتھ مستقل رہائش کے لیے آرہے تھے۔ اناؤنسر نے جہاز کی آمد کی اطلاع دی تو حیات بیگم خوشی سے کھلتے ہوئے کہنے لگی۔ "میرے بیٹے نے دن رات پڑھ کر امتحان دیا ہو گا۔ دبلا ہو گیا ہو گا۔ پہلے جیسی صحت نہیں رہی ہو گی۔"

رحمت علی نے کہا۔ "دعا کرو' وہ صحت مند ہو۔ اگر بیمار ہوا تو وہ خبطی بیٹا اپنے ساتھ سلمان کو بھی بیمار بنا کر لائے گا۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "میں نے کئی بار کہا ہے' میرے بیٹے کو خبطی نہ کہا کریں۔ آپ کہتے ہیں تو دوسرے رشتے دار بھی اسے خبطی سمجھنے لگتے ہیں۔"

قادر جان نے کہا۔ "میرا بھانجا لاکھوں میں ایک ہے۔ جب اپنی ذہانت سے ہماری فیکٹری سنبھالے گا تو ترقی کرتا ہوا ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری فیکٹریاں قائم کرتا جائے گا۔ اس وقت اسے ایب نارمل کہنے والے اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے۔"

وہ دونوں لوگیج ہال سے اپنا سامان لے کر آئے۔ ماں نے کامران کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔ خوشی سے رونے لگی۔ سلمان باپ کے گلے لگ گیا۔ اس نے حیات بیگم کو سلام کیا۔ "ممی! السلام علیکم۔"

حیات بیگم نے آنسو پونچھنے کے بہانے منہ پر آنچل رکھ لیا۔ یوں منہ ڈھانپنے کے بہانے سلام کے جواب میں سلامتی نہیں بھیجی۔ قادر جان اپنے بھانجے کو گلے لگا کر دعائیں دینے لگا۔ سلمان گلے لگنے آیا تو اس نے صرف مصافحہ کیا پھر وہ سب عمارت کے باہر ایک نئی مرسڈیز کار کے پاس آئے۔ کامران نے اسے دیکھ کر خوش ہو کر کہا۔ "واؤ' یہ تو برانڈ نیو ماڈل ہے۔ اسے کب خریدا؟"

حیات بیگم نے فخر سے کہا۔ "کل ہی تمہارے لیے یہ کار خریدی ہے۔ میری طرف

سے یہ تحفہ ہے' یہ لو چابی۔"

"آپ نے میرے لیے خریدی ہے اور سلمان کے لیے؟"

رحمت علی نے کہا۔ "یہ کار تم دونوں کے لیے ہے۔ تم دونوں اسے استعمال کرو گے۔"

"لیکن ممی کہہ رہی ہیں کہ میرے لیے خریدی ہے؟"

"بھئی کہہ تو رہا ہوں' دونوں کے لیے خریدی ہے۔"

کامران نے کہا۔ "آپ گاڑی کے کاغذات دکھائیں۔ میں دیکھوں گا کہ یہ کس کے نام خریدی گئی ہے۔"

باپ نے سخت لہجے میں کہا۔ "کیا تم ٹریفک پولیس کی طرح سب کے سامنے گاڑی کے کاغذات چیک کرو گے۔ کیا تمہیں اپنے باپ کی بات پر بھروسا نہیں ہے؟"

"سوری ڈیڈی! آپ سلمان کے معاملات میں ممی کے سامنے مجبور ہو جاتے ہیں۔"

حیات بیگم نے کہا۔ "کامران! تمہارے آنے کی جتنی خوشیاں مجھے مل رہی ہیں' تم انہیں خاک میں ملا رہے ہو پھر پہلے جیسی ہٹ دھرمی دکھا رہے ہو۔"

سلمان نے کہا۔ "یار! یہاں بات نہ بڑھا۔ جو بات ہے وہ گھر چل کر ہو جائے گی۔"

کامران نے کہا۔ "یہ پورا خاندان جانتا ہے کہ ہم اپنے لیے ایک نہیں دو چیزیں خریدتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے ایک چیز خریدی جائے تو بڑے بیٹے کے نام سے خریدی جاتی ہے۔ اس کار کو بھی تیرے نام سے ہونا چاہیے۔"

رحمت علی نے حیات بیگم سے کہا۔ "میں نے پہلے ہی سمجھایا تھا' کار اس خبطی کے نام سے نہیں سلمان کے نام سے خریدو۔ یہ خواہ مخواہ فساد پھیلائے گا اور پھیلا رہا ہے۔ اب خود ہی اپنے لاڈلے کو سمجھاؤ۔"

حیات بیگم نے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خدا کے لیے یہاں سے چلو۔ سمجھ لو' ماں سے ایک غلطی ہو گئی آئندہ نہیں ہو گی۔"

کامران نے کہا۔ "آپ میری ماں ہیں۔ آپ غلط نہیں ہو سکتیں۔ یہ کار غلط ہے۔ میں اس میں نہیں بیٹھوں گا۔ آپ ڈیڈی کے ساتھ جائیں۔ میں سلمان کے ساتھ ٹیکسی میں آجاؤں گا۔"

ماں باپ اسے بے بسی سے دیکھنے لگے۔ لوگوں کی بھیڑ میں جوان بیٹے کو غصہ نہیں

دکھا سکتے تھے۔ پہلے بھی کئی بار غصہ دکھا چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے لندن واپس چلا جاتا تھا۔ رحمت علی نے اپنے سالے سے کہا۔ "یہ کوٹھی کا پتا نہیں جانتے ہیں۔ انہیں ٹیکسی میں لے آؤ۔"

وہ غصے میں آکر مرسڈیز میں بیٹھ گیا پھر بیگم کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ وہ دونوں' ماموں قادر جان کے ساتھ کوٹھی میں آئے تو ان کے دادا چوہدری حشمت علی نے دونوں کو گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے دعائیں دیں پھر ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہارے باپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم دونوں مرسڈیز میں نہیں آؤ گے۔ بیٹے کامران! آئی ایم پراوڈ آف یو۔"

لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ کھانے کی میز پر حشمت علی نے اپنے بیٹے رحمت علی سے کہا "تم نے یہ نئی فیکٹری قائم کی ہے۔ سلمان اور کامران کو ساتھ رکھو اور دونوں کو کاروبار میں زیادہ سے زیادہ مصروف رکھو۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہارے بیٹے تمہارے بازو ہیں۔"

کامران نے کہا۔ "دادا جان! مجھے کاروبار سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میں اپنا ایک بہت بڑا اسٹوڈیو قائم کرنا چاہتا ہوں۔"

دادا نے کہا۔ "ہمیں تمہاری کمزوری معلوم ہے۔ جو سلمان کرے گا' وہی تم کرو گے۔ مصوری کے شوق کو صرف ایک مشغلہ بنا کر رکھو۔ تم دونوں کو اپنے دادا جان سے بھی زیادہ ایک بہت بڑا بزنس مین بننا ہو گا۔"

وہ دونوں کھانے کے بعد اپنے بیڈ روم میں آئے پھر دروازہ اندر سے بند کر کے لندن کال کرنے لگے۔ آبرو نے کہا تھا کہ پاکستان پہنچتے ہی وہ اس سے فون کے ذریعے رابطہ کریں۔

سلمان نے ریسیور کامران کو دیا تھا اور خود ڈائل کر رہا تھا۔ جلد ہی رابطہ ہو گیا۔ آبرو کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون؟"

"میں ہوں کامران! ہم ابھی پہنچے ہیں۔ بالکل خیریت سے ہیں۔ یہ لو' سلمان سے بات کرو۔"

سلمان نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو آبرو! میں سلمان بول رہا ہوں۔"

"ہائے سلمان! ڈائری تو ضرور پڑھی ہو گی۔"

"ہاں۔ سفر کے دوران میں تنہائی کا احساس نہیں ہوا۔ یہ لو' کامران سے بات کرو۔"

کامران نے ریسیور لے کر کہا۔ "ہائے آبرو! ہم نے تمہارا خط پڑھا تھا۔ اس خط کی تحریر سے تمہاری بھرپور ذہانت کا اندازہ ہوا۔ کوئی ادیبہ یا شاعرہ ہی ایسا خط لکھ سکتی ہے۔"

"جناب کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے شاعری سے گہرا لگاؤ ہے۔ کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتی ہوں۔ یہ آبرو میرا نام نہیں تخلص ہے۔ نام تو کچھ اور ہے۔"

کامران نے سلمان سے کہا۔ "پتا ہے' یہ محترمہ کیا فرما رہی ہیں۔ آبرو تخلص ہے یعنی کہ محترمہ نے ہمیں اپنا اصل نام نہیں بتایا ہے۔"

سلمان نے ریسیور لے کر کہا۔ "کیا یہ سچ ہے؟ تمہارا نام آبرو نہیں ہے؟"

وہ بولی۔ "کیا فرق پڑتا ہے۔ نام نہ سہی' تخلص تو ہے۔ اسے نام سمجھ لو۔ جب تم اپنی زبان سے آبرو کہتے ہو تو ایسا لگتا ہے' مجھے اپنی آبرو بنا چکے ہو۔"

"آں!" وہ ذرا ہچکچانے لگا۔ کامران کی موجودگی میں وہ پیار بھری باتوں کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ لو' کامران سے باتیں کرو۔"

اس نے ریسیور لیا۔ آبرو نے پوچھا۔ "تمہارے ہاتھوں میں ریسیور ہے یا فٹ بال؟ ایک دوسرے کی طرف اچھالتے جا رہے ہو۔ تم میں سے کوئی بھی پوری بات نہیں کر رہا ہے۔ آدھی بات کرتے ہو پھر مجھے دوسری پٹڑی پر پہنچا دیتے ہو۔"

"میری آدھی اور اس کی آدھی ملا کر پوری بات ہو جاتی ہے۔ بات تو تم نے ادھوری چھوڑ دی۔ اپنا نام نہیں بتایا۔ چلو فوراً اپنا اصلی نام بتاؤ۔"

"میرا اصلی نام بہت بیک ورڈ ہے۔ نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ مجھے آبرو ہی کہا کرو۔"

اس نے سلمان سے کہا۔ "یار! اپنا اصلی نام نہیں بتا رہی ہے۔ تو ہی پوچھ۔"

سلمان نے ریسیور لے کر پوچھا۔ "تم اصلی نام کیوں چھپا رہی ہو؟ کوئی خاص وجہ ہے؟"

"ہاں۔ فرسودہ قسم کا پرانے زمانے کا نام ہے۔ بس مجھے آبرو کہا کرو۔"

"تمہارا نام تو خواہ کتنا ہی پرانا ہو' ہمارے لیے نیا اور سب سے عزیز ہو گا۔"

فون پر تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر وہ بولی۔ "خواہ مخواہ ضد کر رہے ہو تو سنو' میرا نام زیتون بی بی ہے۔"

"زیتون بی بی!" وہ تعجب سے بولا۔

کامران نے پوچھا۔ "زیتون بی بی؟ کیا یہ آبرو کا نام ہے؟"
آبرو نے کہا۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا' نام نہ پوچھو۔ مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔"
سلمان نے کہا۔ "یہ ہمیں نام بتا کر شرمندہ ہو رہی ہے۔"

کامران نے ریسیور لے کر کہا۔ "اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔ یہ نام آج کل نایاب ہے اور جو چیز نایاب ہوتی ہے' اس کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے پھر ہمیں نام معلوم کرنا تھا' وہ کر لیا۔ ہم تمہیں آبرو ہی کہا کریں گے۔"

"مجھے اپنا فون نمبر اور ایڈریس بتاؤ۔"

"او گاڈ! تم سے باتیں کرنے کی اتنی جلدی تھی کہ ہم فون نمبر اور اس کوٹھی کا پتا پوچھنا بھول گئے۔ اگلی بار تمہیں بتائیں گے۔ یہ لو' سلمان کو گڈ بائی کہو۔"

سلمان نے ریسیور لے کر کہا۔ "آبرو! باتیں بہت ہیں۔ آئندہ قسطوں میں ہوتی رہیں گی۔"

"ایک دن میں فون کروں گی اور ایک دن تم کرو گے' وعدہ؟"

"وعدہ۔ اللہ حافظ!"

رابطہ ختم ہو گیا۔ دوسرے دن ان کے دادا حشمت علی لاہور چلے گئے۔ وہ صرف اپنے پوتوں سے ملنے کی خاطر دونوں کے لیے آئے تھے۔ انہیں یہ تاکید کرتے گئے کہ وہ کاروبار میں دل لگائیں۔ کامران کا دل حساب کتاب اور لین دین کے جھمیلوں میں نہیں لگتا تھا لیکن سلمان کے ساتھ رہنے کا عادی تھا اس لیے روز فیکٹری جاتا تھا۔ سلمان سنجیدگی اور دل جمعی سے کاروبار سنبھالنے لگا۔ کامران نے فیکٹری کے ایک حصے میں چھوٹا سا اسٹوڈیو بنا لیا تھا۔ وہاں خیالوں کی دنیا میں وہ آبرو کے ساتھ خاصا وقت گزار دیا کرتا تھا۔ آبرو سے سلمان کا رابطہ فون کے ذریعے رہتا تھا۔ وہ ڈیڑھ برس بعد تعلیم مکمل کر کے پاکستان آنے والی تھی۔ اس عرصے میں سلمان نے کاروبار کی طرف خوب توجہ دی۔ اگر کراچی کے حالات کاروبار کے لیے سازگار رہتے تو وہ فیکٹری کے منافع میں کئی گنا اضافہ کر دیتا لیکن اتنی محنت کے بعد بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے شہر کے تمام ایجنٹوں اور بڑی بڑی ٹیکسٹائل ملز والوں سے اچھے تعلقات رکھے تھے اس لیے فیکٹری نقصان میں نہیں تھی۔ پچھلے برس کے منافع کی شرح پر ٹھہر گئی تھی۔ یہ بھی بڑی بات تھی کہ وہ فیکٹری کو نقصان سے بچا رہا تھا۔

رحمت علی ذرا آرام طلب تھا۔ پینے پلانے کا بھی عادی تھا۔ حیات بیگم امارت اور شان و شوکت کی نمائش ایسے کرتی تھی جیسے خود کو سب سے نمایاں رکھنے کی بیماری لگ چکی ہو۔ صاحب کلبوں میں جا کر پیتے تھے اور پتے کھیلتے تھے۔ بیگم صاحبہ اونچی سوسائٹی کی بیگمات کے نقشِ قدم پر چلتی تھیں اور بڑی بڑی تقریبات میں دل کھول کر بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتی تھیں۔

اس طرح آمدنی اور اخراجات کا توازن بگڑنے لگا۔ سلمان نے کہا۔ "ڈیڈی! اخراجات پر کنٹرول کریں۔ آمدنی کا گراف نیچے جا رہا ہے۔"

حیات بیگم نے کہا۔ "اپنے باپ کی آڑ میں مجھے باتیں سنا رہے ہو۔ دو لاکھ روپے کی جیولری کا بل آیا ہے تو اس کی پے منٹ نہیں کر رہے ہو۔ جیسے میں تمہاری کمائی کھا رہی ہوں۔ میں تو اپنے شوہر کی دولت پر عیش کر رہی ہوں۔"

رحمت علی نشے میں تھا۔ اس نے سلمان کو ڈانٹ کر کہا۔ "تمہیں فیکٹری کا انچارج بنایا ہے' مالک نہیں بنایا ہے۔ تمہاری ممی جو کہہ رہی ہیں' وہ کرو۔ دو لاکھ کی پے منٹ کر دو۔"

"ڈیڈی! فیکٹری کی آمدنی اتنی نہیں ہے کہ بیک وقت دو لاکھ روپے ادا کیے جائیں۔ یہ رقم قسطوں میں ادا ہو سکے گی۔ آپ کو یقین نہیں آ رہا ہے تو کل فیکٹری میں آ کر تمام کھاتے چیک کر لیں۔"

وہ باپ کے کمرے سے چلا گیا۔ حیات بیگم نے کہا۔ "آپ مجھے الزام دیتے ہیں کہ میں سوتیلی ماں بن کر رہتی ہوں۔ آج آپ نے دیکھ لیا کہ وہ سوتیلا بن کر کس طرح اپنی اصلیت دکھا رہا ہے۔"

"اچھا اب جانے بھی دو۔ میں نے کہہ دیا ہے' پے منٹ ہو جائے گی۔"

"اس ایک ہی پے منٹ کی بات نہیں ہے۔ کیا میں آئندہ بھی اس لڑکے کے آگے ہاتھ پھیلاتی رہوں گی؟ پتا نہیں فیکٹری سے کتنی آمدنی ہوتی ہے۔ آپ نے اس پر بھروسا کیا ہوا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ بے ایمانی نہیں کرتا ہو گا؟ وہ اپنا ذاتی بینک بیلنس نہیں بڑھاتا ہو گا؟"

"میں کل جا کر اکاؤنٹس چیک کروں گا۔"

"آپ میری بات سمجھیں۔ میں بھی ایک بزنس مین کی بیٹی ہوں۔ کیا میں فیکٹری

نہیں سنبھال سکتی؟"

"تم عورت ہو۔ ہمارے کاروبار میں فیلڈ ورک ضروری ہے۔ یہ تم نہیں کر سکو گی۔"

"میں بہت ضدی عورت ہوں۔ کسی کام کا ارادہ کر لوں تو اسے کرتی ضرور ہوں۔ فیکٹری میں سنبھالوں گی اور فیلڈ ورک میرا بھائی قادر جان کرے گا اور اتنا ہی نہیں' اپنے کامران کو بھی اس طرح کاروبار میں لگاؤں گی کہ وہ خیالوں کی دنیا سے نکل کر مصوری بھول جائے گا۔"

"ٹھیک ہے' ہم سب مل کر فیکٹری سنبھالیں گے تم نے تو سارا نشہ چوپٹ کر دیا ہے۔ لاؤ ایک پیگ دو۔ میرے پاس آؤ اور ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دو۔"

دوسرے دن پورا خاندان فیکٹری پہنچ گیا۔ رحمت علی اکاؤنٹس چیک کرنے لگا۔ حیات بیگم اپنے بھائی قادر جان اور بیٹے کامران کو ساتھ لائی تھی۔ کامران یوں بھی سلمان کے ساتھ آتا تھا لیکن کاروباری معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ فیکٹری میں قائم کئے ہوئے اسٹوڈیو میں زیادہ وقت گزارتا تھا۔ اس طرح سلمان کے قریب رہتا تھا۔

حیات بیگم نے کہا۔ "کامران! یہ کاروبار کی جگہ ہے۔ پینٹنگ کا یہ تمام سامان اپنی کوٹھی والے اسٹوڈیو میں لے جاؤ۔ وہاں رات کو مصوری کا شوق پورا کیا کرو۔ یہاں دن کو کاروبار سنبھالو۔ یہ باس کا کمرا ہے اور کرسی ہے۔ یہاں بیٹھا کرو۔"

"ممی! اس کرسی پر پچھلے ایک برس دو مہینے سے سلمان بیٹھتا آ رہا ہے۔ آپ مجھے بھی باس بنانا چاہتی ہیں تو دوسری ایسی ہی کرسی لانی ہو گی۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ باس ایک ہی ہوتا ہے اور کرسی بھی ایک ہی رہے گی۔ آج سے میں یہاں کی انچارج ہوں اس لیے تم کرسی پر بیٹھو گے۔"

"سوری ممی! ساری دنیا میں کرسی کا جھگڑا چل رہا ہے۔ میں اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ایک کی کرسی دوسرا چھینتا ہے۔ میں نہیں چھین سکتا' ایسی ہی دوسری بنوا کر سلمان کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں۔"

وہ تو سلمان کو کرسی سے اتارنا چاہتی تھی۔ فیکٹری پر قبضہ جمانے آئی تھی۔ خود اس کرسی پر بیٹھ کر بولی۔ "ایک دن تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ تب سمجھو گے کہ سلمان نے تمہیں لندن سے یہاں تک کچھ سیکھنے اور عقل سے کچھ سمجھنے کا موقع نہیں دیا ہے۔

وہ میٹھا زہر ہے۔ دوست بن کر آہستہ آہستہ تمہارے حلق سے اتر رہا ہے۔"

"ممی! کبھی میٹھا زہر مجھے ہلاک کرے گا تو مجھے دم توڑنے کے لیے آپ کی آغوش مل جائے گی لیکن وہ آپ کی نفرت سے مرے گا تو اسے ماں کی گود کہاں ملے گی؟"

وہ بیٹے کو گھورنے لگی۔ بیٹے نے کہا۔ "اگر میں اس کی حمایت میں بولتا ہوں تو وہ بھی مجھ پر جان دیتا ہے۔ میں دن کو رات کہوں تو وہ رات کہتا ہے۔ میں اس سے کہوں کہ گھر چھوڑ دے' وہ چھوڑ دے گا۔ دنیا چھوڑنے کو کہوں تو دنیا بھی چھوڑ دے گا۔"

حیات بیگم نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "میں نہیں چاہتی کہ وہ گھر چھوڑ دے۔ تم اتنے یقین سے دعویٰ کر رہے ہو تو اس سے کہو' یہ فیکٹری چھوڑ دے اور آئندہ یہاں کے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔"

کامران نے چپراسی کو بلا کر کہا۔ "سلمان صاحب کو فوراً بلا کر لاؤ۔"

سلمان اپنے باپ کے ساتھ اکاؤنٹ سیکشن میں تھا۔ قادر جان بھی ان کے ساتھ پچھلا تمام حساب چیک کر رہا تھا۔ چپراسی نے آ کر کہا۔ "جناب! آپ کو چھوٹے صاحب بلا رہے ہیں۔"

سلمان نے باپ سے کہا۔ "آپ دیکھ رہے ہیں کہ تمام حساب بالکل صاف اور واضح ہے پھر بھی کچھ پوچھنا ہو تو مجھے بلا لیں۔ میں جا رہا ہوں۔"

"میں تمہیں جانے سے روکوں گا تو وہ خبطی بیٹا یہاں چلا آئے گا۔ بہتر ہے تم جاؤ۔ ویسے میں مانتا ہوں کہ تم نے صاف ستھرا حساب رکھا ہے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر فیکٹری کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا دفتر میں آیا۔ دروازہ کھول کر داخل ہوتے ہی حیات بیگم کو اپنی کرسی پر دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔ "ممی! آپ اس کرسی پر بڑی باوقار لگ رہی ہیں۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میں باوقار نہیں تھی؟ میری کوئی پرسنیلٹی نہیں تھی؟"

وہ بے چارہ گڑبڑا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ ہماری نظروں میں آپ کا مرتبہ ہمیشہ بلند رہا ہے۔ میں تو اس دفتری کرسی کے حوالے سے کہہ رہا ہوں کہ آپ باس کی حیثیت سے باوقار لگ رہی ہیں۔"

"اچھا اب زیادہ صفائی پیش نہ کرو۔ یہ کامران تم سے کچھ کہہ رہا ہے۔"

سلمان نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ کامران نے کہا۔ "کہنا کیا ہے' یہاں سے چھٹی کرو۔ یہ فیکٹری ممی کے حوالے کر دو اور آئندہ بھی یہاں کے معاملات میں مداخلت نہ کرو۔"

سلمان نے کہا۔ "فیکٹری کی تمام چابیاں میز کی دراز میں ہیں۔ اکاؤنٹ سیکشن میں تقریباً جانچ پڑتال ہو چکی ہے۔ ڈیڈی مطمئن ہیں۔ میرے ہاتھ بالکل صاف ہیں۔ میں یہاں سے جا سکتا ہوں؟"

کامران نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم سے کئی بار کہا ہے کہ "میں" نہ کہا کرو "ہم" کہا کرو۔ اچھا ممی! ہم جا رہے ہیں۔"

حیات بیگم اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟ تمہیں یہاں کا کام سنبھالنا ہے' رک جاؤ۔ میں کہتی ہوں رک جاؤ..........."

وہ رکنے والا نہیں تھا۔ سلمان کے ساتھ دروازہ کھول کر چلا گیا۔ وہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر بند دروازے کو دیکھتی رہی۔ ان لمحات میں اسے اپنے بیٹے پر غصہ آیا لیکن وہ یہ سوچ کر اندر سے مطمئن تھی کہ سلمان دودھ کی مکھی کی طرح فیکٹری سے نکل چکا ہے۔

اس دن سے حیات بیگم اور اس کے بھائی قادر جان نے فیکٹری سنبھال لی اور رحمت علی ان کے نگراں رہے۔ ان کی راہنمائی کرتے رہے۔ کاروبار میں نفع و نقصان ہوتا ہی رہتا ہے۔ کراچی کے بدترین سیاسی حالات کے باعث ہر طرح کے چھوٹے بڑے کاروبار پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ سلمان ایک باشعور اور تجربے کار بزنس مین کی طرح فیکٹری کو نقصان سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا اور بڑی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔ رحمت علی نے تسلیم کیا کہ بیٹے نے کاروبار کو سنبھالے رکھنے میں بڑی ذہانت اور حکمتِ عملی کا ثبوت دیا تھا۔

قادر جان اپنی بہن اور بہنوئی کا بڑا فرماں بردار تھا۔ وہاں یوں جم کر رہ گیا جیسے بہن کے ساتھ جہیز میں آیا ہو۔ ان کا ہر کام ایک ملازم کی طرح تندہی سے کرتا تھا۔ کوٹھی کے اندر اور باہر کی سجاوٹ میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ سال دو سال میں کھڑکیوں کے پردے' قالین اور فرنیچر سبھی تبدیل ہوتے تھے۔ قادر جان پرانا فرنیچر بیچنے اور نیا خریدنے میں کافی مال کمایا کرتا تھا۔ کوٹھی کی گاڑیوں کی مرمت ہو یا انہیں فروخت کر کے نئی گاڑیاں خریدنی ہوں' ہر ڈیلنگ میں اسے منہ مانگا کمیشن ملتا رہتا تھا۔ رئیسوں کے گھروں میں گیٹ

ٹو گیدر پارٹیز ہوا کرتی تھیں۔ رحمت علی کی کوٹھی میں بھی ہوتی تھیں۔ وہ ایسی تقریبات کے انتظامات کرتا تھا اور خوب مال بنایا کرتا تھا۔

بہن نے فیکٹری کا چارج سنبھالا تو جیسے قادر جان کی لاٹری نکل آئی۔ وہ مختلف ہتھکنڈوں سے رحمت علی تک پہنچنے والی رقومات میں ہیرا پھیری کرنے لگا۔ ایک تو ویسے ہی کاروبار بیٹھ رہا تھا۔ بہن کی شاہ خرچی نے اور بھائی کی بے ایمانی نے اسے بالکل ہی بٹھا دیا تھا۔ دس ماہ کے بعد ہی فیکٹری میں تالا لگ گیا۔ رحمت علی نے بیگم سے پوچھا۔ "یہ کیا ہو گیا؟"

حیات بیگم نے کہا۔ "وہی ہوا جو سلمان چاہتا تھا۔ اس نے گرتا ہوا کاروبار ہمارے حوالے کیا تھا۔ میں ایک عورت ہو کر اسے کیسے سنبھالتی؟"

"تم نے دعویٰ کیا تھا کہ بزنس مین کی بیٹی ہو۔ تمہارا بھائی فیلڈ ورک میں ماسٹر ہے۔ سلمان نے اپنی مرضی سے کاروبار تمہارے حوالے نہیں کیا تھا۔ تم نے کاروباری حالات کو سمجھے بغیر اتنی بڑی ذمہ داری کیوں قبول کی تھی؟"

ان حالات میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہی ہیں۔ میاں بیوی لڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ فیکٹری میں تالا لگنے والی بات حشمت علی تک پہنچی۔ لاہور سے حشمت علی نے فون پر کہا۔ "جس دن تم نے جوان بیٹوں سے فیکٹری لے کر بیوی کے حوالے کی تھی تب ہی میں نے کہہ دیا تھا کہ تم پر برے دن آنے والے ہیں اور وہ دن آ چکے ہیں۔"

رحمت علی نے کہا۔ "ابا جان! اگر آپ کچھ مدد کریں گے تو فیکٹری پھر اسٹارٹ ہو سکتی ہے۔ بس تھوڑی سی رقم چاہیے۔"

"میرے پاس جو تھا' وہ میں نے تم دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ برکت تمہارا چھوٹا بھائی ہے لیکن کتنی محنت اور لگن سے کاروبار میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ میں نے تمہیں ایک فیکٹری کے علاوہ ایک کروڑ روپے نقد دیئے تھے۔ تم نے صرف دو برسوں میں ایک کروڑ روپے ڈبو دیئے۔ اب مجھ سے کوئی توقع نہ رکھو۔"

باپ نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ رحمت علی جھنجلا کر رہ گیا۔ حیات بیگم نے سمجھایا۔ "لاہور چھوٹے بھائی کے پاس جاؤ۔ پندرہ بیس لاکھ قرض مانگو۔ وہ انکار نہیں کرے گا۔"

اس نے بیوی کے مشورے پر عمل کیا۔ لاہور بھائی اور باپ کے پاس آیا۔ باپ کی عدم موجودگی میں چھوٹے بھائی برکت علی سے کہا۔ "میری فیکٹری ٹھیک چل رہی ہے لیکن

ایک آدھ پارٹی کے پاس بڑی رقمیں رکی ہوئی ہیں۔ اگر تم بیس لاکھ قرض دے دو تو میری پھنسی ہوئی رقم نکل آئے گی۔ میں ایک ماہ میں تمہاری تمام رقم واپس کر دوں گا۔"

برکت علی نے کہا۔ "بھائی جان! آپ کی کاروباری حالت مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس فیکٹری کو دوبارہ اسٹارٹ کرنے کے لیے بیس لاکھ سے بھی زیادہ کی ضرورت ہے۔ آپ میرے بیس لاکھ پھنسانے کی بات نہ کریں۔ بہتر ہے' اس فیکٹری کو بیچ ڈالیں۔ کچھ رقم ملے گی۔ اس رقم سے آپ دوسرا کاروبار شروع کر سکیں گے۔"

"تم مجھے مشورے نہ دو۔ یہ بتاؤ قرض دو گے یا نہیں؟"

"سوری۔ میں جان بُوجھ کر ڈوبنا نہیں چاہوں گا۔"

اس بات پر دونوں بھائیوں میں گرما گرمی ہوئی۔ باپ نے آکر دونوں کو ٹھنڈا کیا پھر رحمت علی سے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ کراچی چل رہا ہوں۔ وہاں فیکٹری کی صحیح پوزیشن معلوم کروں گا۔ اگر وہ سابقہ منافع دینے کے قابل رہی ہو گی تو میں برکت سے رقم لے کر تمہیں دوں گا۔"

چوہدری حشمت علی اپنے دوالیا بیٹے کے ساتھ کراچی آئے۔ وہاں ایک دن آرام کیا پھر فیکٹری کے تمام اکاؤنٹس چیک کیے۔ تمام لین دین کے طریقے معلوم کیے پھر وہ فائلیں رحمت علی اور حیات بیگم کی طرف پھینک کر کہا۔ "تم دونوں کو شرم آنی چاہیے۔ سلمان نے بُرے وقت میں فیکٹری سنبھالی اور کسی سے قرض نہیں لیا اور تم نے پچھلے دس ماہ میں بینک سے پچیس لاکھ روپے قرض لیے ہیں۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے ادا کرو گے؟ فیکٹری کے کاغذات تم لوگوں نے بینک والوں کے پاس رکھوا دیئے ہیں۔"

حشمت علی نے انہیں خوب کھری کھری سنائیں۔ حیات بیگم کبھی کسی کی بات برداشت نہیں کرتی تھی لیکن بہت بڑا نقصان کرنے کے بعد وہ مجرم سی بنی ہوئی تھی۔ مجبوراً سسر کی باتیں برداشت کر رہی تھی۔

سلمان اور کامران ان معاملات میں خاموش تھے۔ کچھ پریشان تھے اور کچھ یقین سا تھا کہ دادا جان کم از کم اپنے پوتوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے ضرور کچھ کریں گے۔

تقریباً ایک ہفتے تک گھر میں خاموشی رہی۔ حشمت علی بھی پریشانی سے سوچتے رہے پھر ایک رات سب کو ڈرائنگ روم میں بلا کر کہا۔ "رحمت! میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ

تم کبھی ایک مستقل مزاج بزنس مین نہیں بن سکو گے۔ تمہارا بیٹا سلمان تم سے زیادہ مستقل مزاج اور معاملہ فہم ہے۔ وہ ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے لانا جانتا ہے۔ لہٰذا اب میں کچھ کروں گا تو سلمان کے لیے کروں گا پھر میرے پاس کیا رہ گیا ہے؟ میں تو برکت سے قرض لے کر دوں گا اور برکت لین دین میں کھرا ہے۔ قرض میں دی ہوئی رقم ضرور واپس لے گا۔"

حیات بیگم نے شوہر کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔ رحمت ایسا تربیت یافتہ شوہر تھا کہ بیوی کی آنکھ کے ایک ایک اشارے کو سمجھتا تھا۔ اس نے کہا۔ "ابا جان! مجھے آخری موقع دیں۔ آپ برکت سے جو رقم لیں گے' میں اسے تین ماہ کے اندر واپس کر دوں گا۔ آپ کے اطمینان کے لیے سلمان کو بھی کاروبار میں ساتھ رکھوں گا۔ اس بار آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچے گی۔"

حشمت علی نے کہا۔ "میں ایک ہفتے تک غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کاروبار سلمان کے حوالے کیا جائے گا تب ہی برکت قرضہ دے گا۔ دوسری صورت میں تم جو بہتر سمجھتے ہو' کرو۔"

حیات بیگم نے کہا۔ "ابا جان! یہ تو نا انصافی ہے کہ کاروبار سلمان کے حوالے کیا جائے۔ میرا کامران کہاں جائے گا؟"

حشمت علی نے کہا۔ "جہاں سلمان جائے گا' وہاں کامران جائے گا اور جہاں کامران نہیں جائے گا' وہاں سلمان بھی نہیں جائے گا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سچے اور کھرے ہیں۔ تم کامران کی فکر نہ کرو۔ میں ناانصافی نہیں کر رہا ہوں۔ تم میاں بیوی اچھی طرح آپس میں صلاح مشورہ کر لو پھر جو تمہاری سمجھ میں آئے اس کے مطابق مجھے فیصلہ سنا دو۔ میں کل تک رہوں گا' پرسوں چلا جاؤں گا۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر ایک کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔ حیات بیگم کو جلتے ہوئے تیل کی کڑاہی میں ڈال دیا۔ وہ کسی حال میں یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ سلمان اس گھر اور کاروبار کے سیاہ و سفید کا مالک بن جائے۔

☆======☆======☆

چوہدری حشمت علی صبح خیزی کے عادی تھے۔ لاہور کی کڑکڑاتی ہوئی سردی میں بھی صبح منہ اندھیرے بیدار ہو جاتے تھے۔ پاس والی مسجد میں نماز پڑھتے تھے پھر ہاتھ میں چھڑی

لے کر چہل قدمی کے لیے نکل پڑتے تھے۔ اس روز وہ مسجد سے نکل کر گئے تو واپس نہیں آئے۔ کراچی ان کے لیے انجانی جگہ نہیں تھی۔ کہیں بھٹکنے کا امکان نہیں تھا مگر پتا نہیں وہ کہاں رہ گئے تھے؟

ناشتے کی میز پر ان کا انتظار کیا گیا۔ سلمان نے کہا۔ "پتا نہیں دادا جان کہاں رہ گئے ہیں؟ انہیں اب تک واپس آجانا چاہیے تھا۔"

کامران نے کہا۔ "آج دادا جان لمبی واک کر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ چھڑی ٹیک کر چلتے چلتے لاہور پہنچ جائیں۔"

سلمان اس بات پر مسکرانے لگا۔ حیات بیگم نے ڈانٹ کر کہا۔ "دادا کا مذاق اڑا رہے ہو؟ شرم نہیں آتی۔"

"ممی! اس مذاق میں بدتمیزی تو نہیں ہے۔ میں نے دادا جان کی شان میں گستاخی نہیں کی ہے۔ آپ ہی نے کہا تھا کہ پہلے زمانے کے بزرگ سیکڑوں میل پیدل چل کر ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچ جایا کرتے تھے۔ دادا جان کے لیے بھی ہماری خواہش یہی ہے کہ وہ ایسے ہی تندرست اور توانا رہیں۔"

سلمان بدستور مسکرا رہا تھا۔ وہ جل کر بولی۔ "جب بھی کامران منہ زوری کرتا ہے اور میری باتوں کا الٹا سیدھا جواب دیتا ہے' تمہیں بہت خوشی ہوتی ہے۔ تم دل کھول کر مسکراتے ہو۔"

رحمت علی نے کہا۔ "یہ کامران کی زندہ دلی پر مسکرا رہا ہے۔"

"یہ میری توہین پر مسکرا رہا ہے۔"

"یہ تمہارے سوچنے کا انداز ہے۔ ابا جان ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں اسی لیے تم اَپ سیٹ ہو۔ خود کو سنبھالو' اللہ نے چاہا تو وہ واپس آجائیں گے۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سلمان اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیلی فون کے پاس جاتے ہوئے بولا۔ "شاید دادا جان نے کہیں سے فون کیا ہے۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو کون؟ ہیلو.........ہیلو؟"

اس نے دوسری طرف کی باتیں سنیں پھر "رانگ نمبر" کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

حیات بیگم نے کہا۔ "پتا نہیں' کہاں رہ گئے ہیں؟ انہیں شہر کے حالات کا پتا ہے۔ اگر کہیں کسی کام سے رک گئے ہیں تو انہیں فون تو کرنا چاہیے۔"

رحمت علی نے کہا۔ "وہ مرزا صاحب کے ہاں شطرنج کھیلنے جاتے ہیں اور ان کے ہاں فون نہیں ہے۔"

"کامران! تم ناشتا کرنے کے بعد مرزا صاحب کے گھر جاؤ۔ تمہارے دادا وہاں ضرور ہوں گے۔"

"ممی! میری ایک پینٹنگ ادھوری رہ گئی ہے۔ آج اسے مکمل کرنا ہے۔ آپ ماموں جان کو مرزا صاحب کے گھر بھیج دیں۔"

وہ غصے سے بولی "میں کسی دن تمہاری تمام پینٹنگز کو آگ لگا دوں گی۔ تاجروں کے خاندان میں کوئی شاعر' ادیب اور مصور نہیں ہوتا۔ ہزار بار سمجھایا ہے' کاروبار میں دلچسپی لو۔ تمہارے دادا جان تم سے زیادہ سلمان پر بھروسا کرتے ہیں۔ اگر تم کاروبار میں دلچسپی لیتے تو وہ تمہیں بھی کاروبار کے لیے رقم دینے پر راضی ہو جاتے۔"

"ممی! آپ لطیف احساسات کو سمجھ نہیں پاتی ہیں اس لیے میں ادب اور آرٹ پر آپ سے نہ بحث کرتا ہوں اور نہ کروں گا۔"

رحمت علی نے کہا۔ "ہمیں لطیف احساسات سے کیا لینا ہے۔ ہم باپ دادا کے زمانے سے دو کے دس بنانے کے گر سیکھتے آئے ہیں۔ تمہیں بھی یہی سیکھنا ہے۔ یہ ادب اور آرٹ کنگلوں کا مشغلہ ہوتا ہے۔"

"سوری ڈیڈی! میں آپ سے بھی بحث نہیں کروں گا۔"

"ڈیڈی! کامران کو پینٹنگ مکمل کرنے دیں۔ میں مرزا صاحب کے گھر چلا جاؤں گا۔"

کامران نے کہا۔ "واہ! تو جائے گا اور میں اسٹوڈیو میں اکیلا رہوں گا؟"

"میں فوراً واپس چلا آؤں گا۔"

"پھر میں بھی چلوں گا۔ یہاں سے تو ڈرائیو کرے گا' واپسی پر میں ڈرائیو کروں گا۔"

حیات بیگم نے شوہر سے کہا۔ "دیکھ لیں۔ اس کی انہی حرکتوں سے میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ یہ سلمان کے بغیر رہتا کیوں نہیں ہے؟ ابھی کہہ رہا تھا پینٹنگ مکمل کرنی ہے.........."

"ہم ان کے بچپن سے انہیں دیکھتے آرہے ہیں۔ آج یہ کوئی نئی حرکت نہیں کر رہا ہے۔ صبر کرو' اسے عقل آجائے گی۔"

حیات بیگم نے بے بسی سے پہلے بیٹے کو دیکھا پھر سلمان کو دیکھ کر سوچنے لگی۔ "یہ سوتیلا ہے لیکن میری دھونس میں آجاتا ہے لیکن یہ کم بخت میرا اپنا بیٹا ہی میرے قابو میں نہیں آرہا ہے۔ اسے اپنے برابر رکھتا ہے۔ جو خود کھاتا ہے' اسے کھلاتا ہے۔ جو خود پہنتا ہے' اسے پہناتا ہے۔ میں اعتراض کروں تو بھوک ہڑتال کر دیتا ہے۔ گھر سے بھاگ جانے کی دھمکی دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے میرے پیٹ سے میرا نہیں' میری سوکن کا بچہ ہوا ہے۔"

رحمت علی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں جمیلہ باجی کے گھر جا رہا ہوں۔ ابا جان وہاں ہو سکتے ہیں۔"

حیات بیگم نے کہا۔ "جن رشتہ داروں کے ہاں فون ہیں' میں ابھی فون پر رابطہ کرتی ہوں۔"

سلمان اور کامران کوٹھی سے باہر آگئے۔ سلمان پجیرو کی ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ کامران نے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر کہا۔ "نوٹ کرلے' کار کتنے کلو میٹر چل چکی ہے۔ اب یہاں سے تو جتنے کلو میٹر تک چلائے گا' میں بھی اتنے ہی کلو میٹر ڈرائیو کروں گا۔"

سلمان نے ہنستے ہوئے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بعض اوقات تو بچوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ کیا مجھے برابر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم گاڑی بھی برابر فاصلے تک ڈرائیو کریں؟"

"تو اسے بچکانہ حرکت کہہ لے۔ جب تک میں زندہ ہوں' اپنی قربت' محبت اور تمام حقوق یکساں رکھنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتا رہوں گا۔ یار! ایسا کرنے میں مزہ بھی آتا ہے۔ کیا تو انجوائے نہیں کرتا ہے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "بہت انجوائے کرتا ہوں۔ یاد ہے' ممی اور ڈیڈی تجھے ایب نارمل سمجھ کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔"

"ہاں۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ میں نارمل ہوں لیکن وہ اب بھی مجھے ایب نارمل' خبطی' جذباتی اور جنونی سمجھتے ہیں۔ آگے چل کر پاگل بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"تو ممی کو بہت مایوس کرتا ہے۔ کبھی ان کا دل بھی رکھ لیا کر۔"

"ان کا دل ہو گا تو رکھوں گا۔ ان کے سینے میں تو پتھر ہے۔ پتا نہیں وہ پتھر میرے لیے کیسے دھڑکتا ہے؟"

"ماں کو سمجھو تو وہ سمجھ میں آئے گی۔"

"جب وہ تنہا ہوتی ہیں تو میں ان سے لپٹ کر انہیں پیار کرتا ہوں۔ انہیں بہت چاہتا ہوں۔ آخر انہوں نے مجھے جنم دیا ہے' اپنا دودھ پلایا ہے۔ ایک ماں سے بڑھ کر سوتیلا بھائی نہیں ہوتا۔"

"تو درست کہہ رہا ہے۔"

"اگر میرا بچپن یہاں ممی کے سائے میں گزرتا تو میں شعوری اور غیر شعوری طور پر تجھ سے نفرت کرنا سیکھ لیتا۔ جیسا کہ دنیا کا ہر بچہ اپنے سوتیلے بھائی کو دشمن سمجھنے کا سبق لیتا ہے پھر اس سبق کو بڑھاپے کی آخری سانس تک بھلا نہیں پاتا۔"

"تو مختلف ہے۔ بچپن سے میرے ساتھ ہاسٹل میں رہا ہے۔ ممی سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ان سے کوئی تربیت حاصل نہیں کی۔ ہمیں دیکھ کر خاندان والوں کو یقین نہیں آتا کہ سوتیلے ہماری طرح سگے بن کر رہ سکتے ہیں۔"

کامران نے اس کی طرف گھوم کر پوچھا۔ "تو نے ایک بات نوٹ کی؟"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ ہم آبرو کے بارے میں کچھ کم سوچنے لگے ہیں۔ اس کی باتیں کم کرنے لگے ہیں۔ کل اسے فون کرنے کی ہماری باری تھی لیکن ہم اسے ہیلو نہ کہہ سکے۔"

سلمان نے کہا۔ "دادا جان گھر میں رہتے ہیں تو انکوائری کرتے رہتے ہیں کہ کسے فون کیا جا رہا ہے' اوورسیز کال اتنی لمبی ہوتی ہے۔ ہم کل فون نہ کر سکے' آج کریں گے۔"

"آج تو دادا جان کہیں گم ہو گئے ہیں۔ وہ ملیں گے تو فون کر سکیں گے۔"

سلمان نے کہا۔ "کاروبار ڈوب گیا ہے۔ یہ ایسی پریشانی ہے کہ آبرو اور پیار و محبت کی باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔"

اس نے مرزا صاحب کے مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہ دونوں گاڑی سے اتر کر دروازے پر آئے۔ کال بیل کا بٹن دبایا۔ اندر سے کھانستی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کون ہے بھائی؟"

"دادا جان اندر ہیں؟"

"دادا جان؟ نہیں بھائی! وہ دو دنوں سے نہیں آرہے ہیں۔ سوچ رہا تھا' آج جا کر

ان کی خیریت پوچھوں گا مگر تم پوچھنے چلے آئے۔ آخر یہ بڑے میاں ہیں کہاں؟"

"صبح معمول کے مطابق چہل قدمی کے لیے گئے تھے۔ اب تک واپس نہیں آئے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ وہ گھر میں بتائے بغیر آپ کے پاس بھی نہیں آتے ہیں۔"

"بھئی! یہ تو تشویش کی بات ہے۔ انہیں ڈھونڈو۔ کہیں راستہ نہ بھٹک گئے ہوں۔"

"آپ ان کے کسی اور دوست یا شناسا کو جانتے ہیں؟"

"نہیں بیٹے! تمہارے دادا نے کبھی کسی شناسا کا ذکر نہیں کیا۔ تم اپنے رشتے داروں سے معلوم کرو۔"

وہ دونوں مرزا صاحب کو سلام کر کے گاڑی میں آئے۔ اس بار کامران نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی بھی انہیں تلاش کرنے گئے ہیں۔ ممی نے تمام رشتے داروں سے فون پر پوچھا ہو گا۔ یار! گیارہ بج چکے ہیں۔ وہ کبھی اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہے۔ آخر کہاں گئے ہیں۔"

سلمان نے کہا۔ "ایسا کرتے ہیں' دادا جان چہل قدمی کرتے ہوئے' جن علاقوں اور راستوں سے گزرتے ہیں' ادھر جا کر انہیں تلاش کرتے ہیں۔"

وہ جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے اپنی کوٹھی کے قریب آ گئے۔ پھر وہاں سے ان راستوں کی طرف جانے لگے جہاں سے انہوں نے کبھی کبھی دادا جان کو گزرتے دیکھا تھا لیکن وہ ادھر بھی نظر نہیں آئے۔

اب یہ تشویش ہوئی کہ کوئی حادثہ نہ پیش آیا ہو۔ رحمت علی نے پولیس اسٹیشن میں ان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی۔ ان کی بڑے سائز کی تصویریں بھی دی۔ دوپہر کو حیات بیگم نے لاہور فون کر کے برکت علی کو ان کے گم ہونے کی اطلاع دی اور بتایا کہ انہیں ہر جگہ تلاش کیا جا رہا ہے۔ سلمان اور کامران اندھیرا ہونے تک پٹرول پھونکتے رہے۔ شہر کے ہر اسپتال میں انہیں تلاش کرتے رہے۔ پرائیویٹ کلینک وغیرہ میں جا کر پوچھا۔ آخر تھک ہار کر کوٹھی میں واپس آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد رحمت علی بھی تھکن سے نڈھال ہو کر آیا اور ڈرائنگ روم کے صوفے پر گر پڑا۔

لاہور سے بار بار فون آ رہا تھا اور حشمت علی کی بازیابی کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔ برکت علی نے کہا۔ "بھائی جان! میں نے ابھی تک اماں جان کو نہیں بتایا ہے کہ ابا جان کہیں گم ہو گئے ہیں۔ وہ سنیں گی تو رو رو کر برا حال کر لیں گی۔"

رحمت علی نے کہا۔ "یہ تم نے اچھا کیا۔ ابھی انہیں کچھ نہ بتاؤ۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی ان کی خیریت کی خبر ملے گی۔"

برکت علی سے رابطہ ختم ہوا تو پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ رحمت علی نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا پھر دوسری طرف کی باتیں سن کر کہا۔ "ہاں' میں ہی رحمت علی ہوں۔ چوہدری حشمت علی کا بڑا بیٹا ہوں۔ ہاں......... ہاں' جی ہاں......... کیا؟ اباجان آپ کے پاس ہیں؟"

یہ سن کر سب چونک گئے۔ سلمان اور کامران قریب آ گئے۔ اپنے باپ کے سر سے سر لگا کر ریسیور سے آنے والی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگے۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہم سے کوئی سوال نہ کرو۔ یہ بتاؤ' اپنے باپ کی واپسی زندہ چاہتے ہو یا مُردہ؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم ابا جان کو زندہ واپس چاہتے ہیں۔"

"پھر کل شام تک پچاس لاکھ روپے لے آؤ اور باپ کو لے جاؤ۔"

"پچاس لاکھ روپے؟" وہ شدید حیرانی سے بولا۔ "یہ......... یہ بہت بڑی رقم ہے۔ ہماری حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ تم لوگ کروڑ پتی اور ارب پتی ہو۔ ہم کسی کنگال کو اغوا نہیں کرتے ہیں۔ کل شام تک پچاس لاکھ روپے نہ ملے تو تمہیں اس بڈھے کی لاش مل جائے گی۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔ ہم رقم کا انتظام کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اباجان ہمیں کہاں ملیں گے؟"

"پہلے شام چار بجے تک یقین دلاؤ کہ پوری رقم لے کر آؤ گے پھر ہم ملاقات کی جگہ اور وقت بتائیں گے۔ اگر تمہارے ساتھ پولیس ہو گی یا پھر کوئی سادے لباس میں ہو گا تو وہاں سے اپنے باپ کی لاش لے کر جاؤ گے۔"

"نہیں' کوئی پولیس والا نہیں ہو گا۔ میں تنہا آؤں گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ رحمت علی نے کئی بار ہیلو ہیلو کہہ کر آوازیں دیں پھر ریسیور رکھ کر پریشانی سے حیات بیگم اور اپنے بیٹوں کو دیکھنے لگا۔ حیات بیگم نے کہا۔ "میں آپ کو وہاں تنہا نہیں جانے دوں گی۔ وہ رقم چھین کر آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

رحمت علی نے کہا۔ "تم میری فکر کر رہی ہو۔ یہ تو سوچو کہ پچاس لاکھ کہاں سے آئیں گے؟ اور اس نے کل شام تک کا وقت دیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا ہم کروڑ پتی اور ارب پتی ہیں۔"

وہ بولی۔ "اس میں جھوٹ کیا ہے۔ انہوں نے معلوم کر لیا ہو گا کہ ابا جان کا دوسرا بیٹا کروڑ پتی ہے۔ آپ برکت کو فون تو کریں۔"

رحمت علی نے ریسیور اٹھا کر برکت علی سے رابطہ کیا۔ برکت نے بھائی کی آواز سنتے ہی پوچھا۔ "ابا جان مل گئے؟"

"ہاں مگر بری خبر ہے۔ دہشت گردوں نے انہیں تاوان کے لیے اغوا کیا ہے۔ ایک شخص فون پر دھمکی دے رہا تھا کہ مطلوبہ رقم کل شام تک ادا نہ کی گئی تو وہ ہمیں زندہ نہیں ملیں گے۔"

"او خدایا! کتنی رقم مانگ رہے ہیں؟"

"پچاس لاکھ روپے۔"

"پچاس لاکھ!"

"ہاں، انہیں ابا جان کی حیثیت کا علم ہے۔ وہ شخص ہمیں کروڑ پتی اور ارب پتی کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی مطلوبہ رقم سے کم پر آمادہ نہیں ہو گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ ہمارے ملک کے اتنے بڑے شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ ابا جان جیسے بزرگ کا بھی لحاظ نہیں کیا جا رہا ہے۔ بہرحال ان کا مطالبہ تو پورا کرنا ہی ہو گا۔ آپ آدھی رقم کا انتظام کریں۔ آدھی رقم میں دے دوں گا۔"

"برکت! میرے حالات تم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ فیکٹری میں تالا لگا ہوا ہے۔ کوئی کاروبار نہیں ہے۔ بال بال قرضوں میں جکڑا ہوا ہے پھر بھی ابا جان کی خاطر اپنی یہ کوٹھی فروخت کر سکتا ہوں۔ اس کوٹھی کے مشکل سے بیس لاکھ روپے ملیں گے لیکن کل شام تک یہ کوٹھی فروخت نہیں ہو گی۔ تم ہی اسے خرید کر رقم ادا کر دو۔"

"ایسی باتیں نہ کریں، کیا میں بھائی ہو کر آپ کی جائداد فروخت ہونے دوں گا۔ میں ابھی کراچی کے ایجنٹ سے بات کرتا ہوں۔ وہاں ہمارے جتنے ڈیلرز ہیں، ایجنٹ ان سے رقمیں حاصل کر کے آپ کو پچاس لاکھ روپے دے دے گا۔ جیسے ہی ابا جان واپس مل جائیں، مجھے فون کریں اور انہیں کسی پہلی فلائٹ سے یہاں بھیج دیں۔ میں نہیں چاہتا، وہ

س شہر میں رہیں۔"

حیات بیگم ریسیور سے کان لگائے سن رہی تھی۔ میاں نے ریسیور رکھا تو بولی۔ "میں جانتی تھی، برکت پورے پچاس کا انتظام کر دے گا۔ اللہ کرے، کل صبح تک پوری رقم ہو جائے۔"

سلمان نے کہا۔ "ڈیڈی! آپ چچا جان سے کہیں کہ وہ صرف ایجنٹ پر بھروسا نہ کریں۔ اگر وہ کسی وجہ سے پوری رقم نہ لا سکا تو وہ ظالم دادا جان کو نقصان پہنچائیں گے۔"

رحمت علی سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف دیر تک فون کی گھنٹی بجتی رہی پھر برکت علی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو............کون؟"

"میں تمہارا بھائی ہوں۔ کیا تم سو رہے ہو؟"

"میں اتنا بے حس نہیں ہوں کہ باپ مصیبت میں ہو اور میں لمبی تان کر سو جاؤں۔ میں نے ایجنٹ کو فون کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ کل بینک کے وقت تک ڈیلروں سے رقم وصول کر لے گا۔"

"برکت! یہ کیوں بھول رہے ہو کہ کل جمعہ ہے۔ بینک بند رہیں گے۔ یہاں لوگ لوٹ مار کے خوف سے گھروں اور دکانوں میں بڑی رقمیں نہیں رکھتے ہیں۔ اگر تمہارا ایجنٹ پوری رقم نہ لا سکا تو قیامت آ جائے گی۔ وہ درندے ابا جان کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

"ہوں............ ابا جان کے لیے میں اتنا پریشان ہوں کہ جمعے کا دن بھی بھول گیا۔ کوئی بات نہیں، میں دوسرے ذرائع اختیار کرتا ہوں۔ میرے پاس تیس بتیس لاکھ کیش ہے۔ باقی قرض لے کر کل کسی فلائٹ سے کراچی آؤں گا۔"

"اللہ کرے کہ رقم پوری ہو جائے۔ یہ سوچ سوچ کر میری سانس رک رہی ہے کہ رقم پوری نہ ہوئی تو............"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگا۔ برکت نے کہا۔ "اللہ پر بھروسا کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کل کسی وقت وہاں پہنچ رہا ہوں۔ روانگی سے پہلے آپ کو فون کروں گا۔"

رحمت علی ریسیور رکھ کر اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ دونوں بیٹے اسے تسلیاں دینے

لگے۔ خاندان کے سب سے بڑے بزرگ کہیں مصیبت میں تھے۔ کسی کو نیند نہیں آسکتی تھی لیکن حیات بیگم کو جاگنے کی عادت نہیں تھی پھر سسر کون سا سگا ہوتا ہے کہ اس کے لیے پریشانی ہوتی۔ وہ اپنے بیڈ روم میں جاکر سو گئی۔

رحمت علی کو باپ کا غم تھا۔ وہ غم غلط کرنے کے لیے اپنے کمرے میں آیا اور وہسکی کی بوتل کھول کر بیٹھ گیا۔ قادر جان کو وفاداری ثابت کرنے کے لیے مجبوراً جاگنا پڑا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر اونگھتا رہا' کبھی سوتا رہا اور کبھی جاگتا رہا۔

سلمان اور کامران اپنے بیڈ روم میں آئے۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے اپنے کمرے کا ٹیلی فون سیٹ بدل دیا تھا۔ دوسرے سیٹ پر اسپیکر لگا ہوا تھا جس کے ذریعے کمرے میں بیٹھے ہوئے دوسرے افراد بھی دوسری طرف کی باتیں سن سکتے تھے۔ انہوں نے ایسا سیٹ اس لیے رکھا تھا کہ آبرو نے شکایت کی تھی کہ وہ بار بار ایک دوسرے کو ریسیور دے کر ادھوری باتیں کرتے تھے۔

سلمان نے اسپیکر آن کرتے ہوئے پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

اسپیکر سے آبرو کی آواز سنائی دی۔ "میں وہ ہوں جسے کل سے بھلائے بیٹھے ہو۔ کل فون کرنے کی باری تم دونوں کی تھی مگر فون نہیں کیا اور میں انتظار کرتی رہی۔"

کامران نے کہا۔ "ہم نے تمہیں نہیں بھلایا ہے بلکہ خود کو بھول چکے ہیں۔ اچانک ایسی افتاد آپڑی ہے کہ ہمارے ہوش اُڑے ہوئے ہیں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "ایسی کیا بات ہوگئی ہے؟"

سلمان نے کہا۔ "یہ تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کاروبار ختم ہو چکا ہے لیکن اس سے بھی بڑی مصیبت یہ آئی ہے کہ تاوان حاصل کرنے والے دہشت گردوں نے ہمارے دادا جان کو اغوا کرلیا ہے۔"

آبرو نے چیخ کر کہا۔ "نہیں۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے دھمکی دی ہے کہ کل شام تک پچاس لاکھ روپے ادا نہ کیے گئے تو وہ ہمارے دادا جان کو قتل کردیں گے۔"

وہ پھر چیخ پڑی۔ "نہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ کوئی میرے دادا جان کو قتل نہیں کرے گا۔ میں ابھی لاہور فون کرتی ہوں۔ ابو ابھی پچاس لاکھ ادا کریں گے اور میرے دادا جان درندوں سے چھڑا کر لے آئیں گے۔"

سلمان اور کامران حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور آبرو کو روتے ہوئے بولتے ہوئے سن رہے تھے۔ کامران نے کہا۔ "آبرو! تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ ہم تمہارے دادا جان کو جانتے بھی نہیں ہیں۔ ہم اپنے دادا جان کی بات کر رہے ہیں۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "وہی میرے بھی دادا جان ہیں۔ میں تمہارے برکت چچا جان کی بیٹی اور چوہدری حشمت علی کی پوتی ہوں۔ میں تھوڑی دیر بعد فون کروں گی۔ ابھی ابو سے کہتی ہوں کہ وہ فوراً پچاس لاکھ روپے لے کر کراچی جائیں۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سلمان نے حیرانی سے کہا "آبرو ہماری کزن ہے؟"

کامران نے کہا۔ "چچا جان کی بیٹی کا نام فرخندہ ہے۔"

"ہاں فرخندہ ہے.......... مگر آبرو تخلص رکھا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ خود کو ہم سے کیوں چھپا رہی تھی۔"

"دادا جان کی لاڈلی ہے۔ بے اختیار پھٹ پڑی۔ اپنی اصلیت ظاہر کردی۔"

"میرا خیال ہے وہ پاکستان آنے کے بعد خود کو ظاہر کرنا اور ہمیں حیران کردینا چاہتی تھی۔ بہت بڑا سرپرائز دینا چاہتی تھی۔"

دوسری طرف سے آبرو نے اپنے والد برکت علی سے رابطہ کیا۔ "ہیلو ابو! میں آبرو بول رہی ہوں۔"

"بیٹی! تم نے اتنی رات کو فون کیا ہے' خیریت تو ہے؟"

"ابھی لندن میں آٹھ بجے ہیں۔ زیادہ رات نہیں ہوئی ہے۔ آپ یہ بتائیں دادا جان کہاں ہیں؟"

"وہ کراچی گئے ہوئے ہیں۔"

"کیا وہ کراچی میں خیریت سے ہیں؟"

برکت نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "تم ایسے سوالات کیوں کر رہی ہو؟ بھئی کراچی میں وہ تمہارے تایا ابو کے پاس بخیریت ہیں۔"

"بخیریت نہیں ہیں۔ آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ میرے دادا جان کو اغوا کیا گیا ہے اور آپ لاہور میں بیٹھے ہیں۔ آپ کو فوراً پچاس لاکھ روپے لے کر جانا چاہیے۔"

"میں حیران ہوں کہ تم یہ باتیں کیسے جانتی ہو؟ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی

سلامتی اور واپسی کے لیے پچاس لاکھ روپے ادا کرنے ہوں گے۔"

"میں سب جانتی ہوں۔ آپ میری بات کا جواب دیں۔ آپ یہاں کیوں ہیں؟ رقم لے کر کراچی کیوں نہیں گئے؟"

"باپ کی جان! بینک بند ہونے کے سبب میں دوسری جگہ سے رقمیں حاصل کر رہا ہوں۔ کل دس بجے تک پوری رقم حاصل ہو جائے گی۔ گیارہ بجے فلائٹ سے کراچی جاؤں گا پھر ان بدمعاشوں کو رقم ادا کر کے تمہارے دادا جان کو بخیریت واپس لے آؤں گا۔"

"میں کل صبح آپ کو فون کروں گی۔"

"فون تو تم کرتی ہی رہتی ہو۔ یہ تو بتا دو، تمہیں دادا جان کے اغوا کی خبر کیسے ملی؟"

"مجھے ابھی سلمان اور کامران سے معلوم ہوا ہے۔"

"کیا؟ بھائی جان کے بیٹوں نے تمہیں بتایا ہے؟ تم انہیں کیسے جانتی ہو؟"

"مقدر کی بات ہے ابو! امی نے بہت چاہا تھا کہ میں چچا جان کی فیملی سے دور رہوں لیکن لندن میں اچانک ملاقات ہو گئی تھی۔ میں نے انہیں پہچان لیا تھا لیکن وہ مجھے اپنی کزن کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے۔ آج شاید جان گئے ہیں۔"

اسے فون پر اپنی ماں عشرت بیگم کی آواز سنائی دی۔ "یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ تم ان دونوں سے ملتی رہی ہو؟"

"امی! لندن میں ان سے صرف تین بار ملاقاتیں ہوئیں لیکن وہ مجھے اپنے چچا کی بیٹی کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے۔ وہ پاکستان واپس چلے گئے۔ تب سے فون کے ذریعے ان سے باتیں ہوتی ہیں۔"

"باتیں کیوں ہوتی ہیں؟ میں نے تمہیں منع کیا تھا، ہمیں ان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا اور تم ان دونوں لفنگوں سے باتیں کرتی ہو!"

"پلیز امی! خاندانی جھگڑے اپنی جگہ ہیں لیکن آپ سلمان اور کامران کو نہیں جانتی ہیں۔ وہ اپنے والدین سے بالکل مختلف ہیں۔ بہت سلجھے ہوئے ذہن کے ہیں۔ ہمیشہ صاف اور سیدھی بات کرتے ہیں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے ایسی بے لوث محبت کرتے ہیں کہ میں نے ایسی محبت کبھی سوتیلے بھائیوں میں نہیں دیکھی۔"

"ذرا کم بولو اور میرے سامنے ان کے قصیدے نہ پڑھو۔ آئندہ ان سے فون پر بھی

بات نہ کرنا۔"

"امی! میں نے اتنی تعلیم اس لیے حاصل نہیں کی ہے کہ میں انصاف کی بات نہ کروں۔ جتنی اچھی باتیں ہیں، انہیں کتابوں میں بند رہنے دوں اور آپ کے انتقامی جذبے کے مطابق زندگی گزاروں۔ اگر آپ ایسا چاہیں گی تو میں واپس نہیں آؤں گی۔ مجھے فرسودہ قسم کے خاندانی جھگڑوں میں الجھنا گوارا نہیں ہے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ تم نے کہا تھا، امتحانات ختم ہو چکے ہیں اور تم ہفتے کو واپس آ رہی ہو۔ یاد رکھو، کراچی نہیں جاؤ گی، سیدھی لاہور آؤ گی۔"

"میں ابھی ٹکٹ چینج کرنے جا رہی ہوں۔ پہلے معلوم کروں گی کہ دادا جان کہاں ہیں؟ جہاں وہ ہوں گے، میں وہیں جاؤں گی۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ عشرت بیگم نے ہیلو ہیلو کہہ کر آوازیں دیں پھر ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر برکت علی سے کہا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا اسے اتنی تعلیم نہ دلائیں اور لندن کبھی نہ جانے دیں لیکن آپ نے میری کوئی بات نہیں مانی۔ آپ کے بھائی جان چوہدری رحمت علی اور ان کی حیات بیگم نے ہمیں کچھ کم ستایا، جلایا ہے؟ آخر باپ کی جائداد میں سے اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے۔ یہ شہر بھی چھوڑ دیا۔ جیسے آپ سے خون کا کوئی رشتہ ہی نہ ہو اور ادھر آپ کی لاڈلی ان سے رشتہ جوڑ رہی ہے۔"

"میں نے آبرو سے نہیں کہا کہ وہ وہاں جا کر رشتہ جوڑے۔"

"یہ آپ بیٹی کو آبرو کیوں کہتے ہیں؟ اسے پیدائشی نام سے فرخندہ کیوں نہیں کہتے ہیں۔"

"میری بیٹی شاعرہ ہے۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ میں اسے آبرو کہوں۔ لہٰذا اس کی خوشی کے لیے کہتا ہوں۔ تم تو اس کے نام کے پیچھے بھی پڑ جاتی ہو۔"

"میں آپ کی سیاست کو خوب سمجھتی ہوں۔ آپ نے اسے سمندر پار صرف اس لیے بھیجا ہے کہ وہ میرے میکے والوں سے دور رہے۔"

"اللہ جانتا ہے، میں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ بھائی جان کے بیٹوں میں سے کسی کو اپنا داماد بناؤں۔ بھائی جان اور بھابی جان کتنے لالچی اور خود غرض ہیں، یہ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں اور تم برا نہ مانتا لیکن ہمیشہ یہ سن کر برا مانتی ہو کہ تمہارے بھائی اور بہن کے کسی بیٹے

کو بھی پسند نہیں کرتا ہوں۔"

"ہاں! میرے بھانجے بھتیجے تو آپ کو کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں جبکہ وہ کسی کے لینے میں ہیں' نہ دینے میں ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ وہ سب اللہ میاں کی گائے ہیں لیکن میں اپنی بیٹی کے دروازے پر گائے لا کر باندھنا نہیں چاہتا۔ اس لیے اسے اتنی تعلیم دلائی ہے اور اس حد تک اسے باشعور بنانا چاہا ہے کہ وہ اپنی زندگی گزارنے کی راہیں خود ہی متعین کر سکے۔"

"وہ تو نظر آ رہا ہے۔ سلمان اور کامران سے مل چکی ہے۔ ان سے فون پر باتیں باتیں بھی کرتی ہے۔ ابھی میرے منہ پر ان کی تعریفیں کر رہی تھی۔"

"تعلیم یافتہ لڑکیاں کسی سے نکاح پڑھوانے کے لیے کسی کی تعریفیں نہیں کرتی ہیں بلکہ کسی میں حقیقتاً جو خوبیاں ہوتی ہیں' انہیں سراہتی ہیں۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ رات کے پونے دو ہو رہے ہیں۔ مجھے سونے دو۔"

برکت کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن عشرت بیگم بیٹھی بڑبڑاتی رہی۔ برسوں بعد آج اسے معلوم ہوا تھا کہ آبرو لالچی اور مطلب پرست رحمت علی کے بیٹوں سے واقف ہے اور ان سے فون پر باتیں کرتی ہے۔ یہ ایسا انکشاف تھا کہ عشرت بیگم کی نیند اڑ گئی تھی۔

☆======☆======☆

سلمان اور کامران دونوں ٹیلی فون کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ گھنٹی بجتے ہی کامران نے اسپیکر کو آن کیا پھر پوچھا۔ "ہیلو؟"

"ہیلو۔ میں آبرو بول رہی ہوں۔"

"اوہ آبرو! تم ہمیں سسپنس میں مبتلا کر چکی ہو اور ہم یہاں حیران اور پریشان بیٹھے ہیں۔"

"حیران اور پریشان کیوں ہو؟"

سلمان نے کہا۔ "تمہارے جذباتی انداز اور تمہارے رونے کی آواز نے ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ تم چچا جان کی بیٹی ہو۔ اپنی زبان سے کہو' کیا یہ درست ہے؟"

"ہاں' میں تم دونوں کی کزن فرخندہ عرف آبرو ہوں۔"

کامران نے پوچھا۔ "تم نے یہ بات ہم سے کیوں چھپائی؟"

وہ بولی۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارے بزرگوں کے درمیان کیسے جھگڑے چلے آ رہے ہیں۔ مجھے بچپن سے سمجھایا گیا تھا کہ مجھے تایا ابا اور ان کے بیٹوں سے دور رہنا چاہیے۔"

"لیکن ہم قریب آ گئے۔"

"ہاں......... تقدیر سے کوئی لڑ نہیں سکتا۔ جب لندن میں تم دونوں نے اپنے بارے میں بتایا تو میں تمہیں پہچان گئی اور خود کو چھپا کر یہ دیکھتی اور سمجھتی رہی کہ تم لوگوں سے جتنی نفرتیں کی جا رہی ہیں' وہ کس حد تک درست ہیں؟"

"اس کا مطلب ہے' ہم قابلِ نفرت نہیں ہیں اس لیے ہم سے رابطہ رکھتی ہو۔"

"ہاں' تم دونوں بہت اچھے ہو۔ ہم تینوں چاہیں تو پرانے خاندانی جھگڑے ختم کر سکتے ہیں۔"

"انشاء اللہ ہم یہ کوشش کریں گے لیکن ایک سچ بات کہہ دوں کہ میری ممی انتہائی خود غرض ہیں اور ڈیڈی ان کے اشاروں پر چلتے ہیں۔"

سلمان نے کہا۔ "کامران' یہ بری بات ہے۔ ہمارے والدین جیسے بھی ہوں' وہ ہمارے بزرگ ہیں۔ ہم پر ان کا احترام واجب ہے۔"

کامران نے کہا۔ "اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہم آبرو کو ان کے متعلق اندھیرے میں رکھیں۔"

"آبرو کے پاس تعلیم ہے۔ ذہانت ہے۔ اچھا برا کیا ہے' اسے خود سمجھنے دو۔ انہوں نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ ہمیں اعلیٰ تعلیم دلائی ہے۔ ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم ان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالیں۔"

آبرو نے کہا۔ "میں یہاں فون پر موجود ہوں اور تم دونوں آپس میں بولے جا رہے ہو۔ کیا میں فون بند کر دوں؟"

"ایسا غضب نہ کرنا۔ یہ بتاؤ' تم نے ابھی چچا جان سے بات کی تھی؟"

"ہاں۔ وہ کل پچاس لاکھ روپے لے کر کراچی پہنچیں گے۔"

"کیا تم نہیں آؤ گی؟"

"میرے امتحانات ہو چکے ہیں۔ میں ہفتے کو لاہور پہنچنے والی تھی لیکن اب معلوم کروں گی کہ دادا جان رہائی پانے کے بعد کہاں رہیں گے؟ میں پہلے دادا جان کے پاس

جاؤں گی۔"

"اللہ نے چاہا تو وہ آج شام تک آجائیں گے اور چچا جان انہیں رات کی فلائٹ سے ہی لاہور لے جائیں گے۔ اب تو ہم بھی دادا جان کے ساتھ جائیں گے تاکہ وہاں تم سے ملاقات ہو سکے۔"

"مجھے خوشی ہو گی لیکن ملاقات آسان نہیں ہو گی۔ کانٹوں سے الجھنا ہو گا۔"

"پھول سے ملنے کے لیے کانٹوں سے الجھنا ہی پڑتا ہے۔"

"سلمان' میں بہت پریشان ہوں۔ دادا جان آئیں گے نا؟"

"انشاء اللہ ضرور آئیں گے۔ دل سے پریشانیاں نکالو اور آرام سے سو جاؤ۔"

کامران نے کہا۔ "کل پاکستانی وقت کے مطابق پانچ بجے شام کو فون کرو۔ اس سے پہلے دادا جان آجائیں گے تو ہم تمہیں فون کریں گے۔ اب آرام کرو۔ شب بخیر۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ شب ان کے کہنے کے مطابق بخیر رہی اور بخیریت سے گزر گئی۔

دوسرے دن برکت علی پوری رقم لے کر کراچی آگیا۔ رحمت علی' سلمان اور کامران اسے ائرپورٹ سے گھر لے آئے۔ برکت نے پوچھا۔ "ان دہشت گردوں سے لین دین کیسے ہو گا؟"

رحمت علی نے کہا۔ "وہ شام چار بجے فون کریں گے پھر لین دین کا طریقہ کار بتائیں گے۔"

"کیا ان سے توقع رکھی جائے کہ وہ زبان کے پابند رہیں گے اور رقم لے کر ابا جان کو رہا کر دیں گے؟"

"ان سے یہ توقع رکھنی ہو گی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر وہ مقررہ مقام پر پولیس یا غیر ضروری افراد کو دیکھیں گے تو ابا جان کو نقصان پہنچائیں گے۔"

سلمان نے کہا۔ "ڈیڈی! میں رقم لے کر جاؤں گا اور بہت محتاط رہوں گا۔"

رحمت علی نے کہا۔ "اس نامعلوم شخص نے پہلے مجھ سے گفتگو کی تھی اور مجھ سے ہی رقم کا مطالبہ کیا تھا۔ شاید وہ چاہے گا کہ میں ہی رقم لے کر ان کے پاس جاؤں اور ابا جان کو واپس لے کر آؤں۔"

کامران نے کہا۔ "انہیں مطلوبہ رقم سے مطلب ہے۔ چاہے وہ رقم لے کر کوئی بھی جائے۔ میں اور سلمان جائیں گے۔"

حیات بیگم نے تڑپ کر کامران سے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ تم ان سب جھمیلوں میں نہ پڑو۔ خیالی دنیا میں رہتے ہو۔ کسی نے گولی چلائی تو اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکو گے۔ یہ رقم سلمان لے کر جائے گا۔"

کامران نے کہا۔ "آپ خواہ مخواہ بحث نہ کریں کیونکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں' ہم ہر جگہ ساتھ جاتے ہیں اور ساتھ رہتے ہیں۔ میں سلمان کو جنت میں تو کیا' جہنم میں بھی تنہا نہیں جانے دوں گا۔"

"تم دونوں جہنم میں جاؤ لیکن میں تمہیں جیتے جی نہیں جانے دوں گی۔ تم گھر سے باہر قدم نکالو گے تو میں اپنی جان دے دوں گی۔"

رحمت علی نے کہا۔ "بیگم! خاموش رہو۔ پہلے ان دہشت گردوں کو فون پر معاملات تو طے کرنے دو۔ ہم اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکیں گے۔ وہ جو کہیں گے' ہمیں اس کے مطابق عمل کرنا ہو گا۔"

انہوں نے لنچ کیا پھر انتظار کرنے لگے۔ ٹھیک چار بجے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ رحمت علی نے اسپیکر آن کیا پھر کہا۔ "میں چوہدری رحمت بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہم کل سے تم پر اور تمہارے دونوں بیٹوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تم نے عقل مندی کی ہے کہ پولیس کے پاس نہیں گئے۔ اب بتاؤ رقم ادا رہے ہو؟"

"ہاں۔ ہم رقم ادا کریں گے لیکن تم جہاں بھی بلاؤ وہاں ہمارے ابا جان کو ساتھ لاؤ تاکہ اسی جگہ لین دین ہو جائے۔"

"کوئی چالاکی نہیں دکھانا۔ صرف ایک آدمی وہ رقم اخبار میں لپیٹ کر لائے گا۔ کوئی دوسرا شخص یا پولیس والا دور تک نظر نہیں آنا چاہیے۔ ہم تمہیں اور تمہارے دونوں بیٹوں کو صورت سے پہچانتے ہیں اس لیے تم تینوں میں سے کوئی ایک آسکتا ہے۔"

رحمت علی نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں آؤں گا۔ جگہ بتاؤ۔"

"کھوکھرا پار میں ایک اسپتال کی شکستہ عمارت کے پیچھے ریلوے لائن ہے۔ وہ ریلوے لائن بھارت کی طرف جاتی ہے۔ تم اپنی گاڑی سے اتر کر اس لائن پر چلتے رہو گے۔ وہیں کسی جگہ ہم تم سے ملاقات کریں گے۔"

"میں ابھی رقم لے کر آرہا ہوں۔"

"اور سنو۔ تمہاری کوٹھی سے صرف تم باہر آؤ گے۔ باقی لوگ گھر میں رہیں گے۔ اگر تمہارے پیچھے کوئی گھر سے نکل کر تمہارے تعاقب میں آئے گا تو ہمیں خبر ہو جائے گی۔ ہمارا ایک آدمی تمہاری کوٹھی کی نگرانی کر رہا ہے۔"

"میں بالکل تنہا آؤں گا۔ میرے پیچھے کوئی اس کوٹھی سے باہر نہیں نکلے گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ سلمان نے کامران سے کہا۔ "مجھے جانے دو۔ آج میرے ساتھ رہنے کی ضد نہ کرو۔"

کامران نے کہا۔ "یہی میں تم سے کہتا ہوں۔ کیا مجھے تنہا جانے دو گے؟"

رحمت علی اور برکت علی نوٹوں کی گڈیوں کو ایک پرانے اخبار میں لپیٹ رہے تھے۔ رحمت نے کہا۔ "تم دونوں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں۔ اس لیے میں بحث میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔"

وہ اخبار کا ایک بنڈل سا بنا کر وہاں سے چلا گیا۔ گھر کے باقی افراد اسے کھڑکیوں سے جاتا دیکھنے لگے۔ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ سب واپس ڈرائنگ روم میں فون کے اطراف صوفوں پر بیٹھ گئے۔ قادر جان ان کے لیے ٹرے میں چائے لے آیا۔ وہ رحمت علی اور حشمت علی کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

یہ انتظار بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب شروع ہوتا ہے تو ختم ہونے کو نہیں آتا۔ اگر انتظار کی مدت مختصر رہے' تب بھی مدت شیطان کی آنت کی طرح لمبی لگتی ہے۔

رحمت علی نے کہا تھا کہ حشمت علی کو رہا کراتے ہی کہیں قریب ٹیلی فون کی سہولت حاصل ہو گی تو وہ وہیں سے ان کی رہائی کی خوشخبری سنائے گا۔ ان بھائیوں کے پاس موبائل فون تھے لیکن وہ انہیں کراچی اور حیدر آباد میں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ان دونوں شہروں میں موبائل کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ برکت علی نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اسپیکر کو آن کیا۔ دوسری طرف سے آبرو کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو میں آبرو بول رہی ہوں۔"

برکت علی نے کہا۔ "بیٹی! میں کراچی آ گیا ہوں۔ تمہارے تایا ابو رقم لے کر گئے ہیں۔ ہم تمہارے دادا جان کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ ضرور واپس آ جائیں گے۔"

سلمان نے کہا۔ "آبرو! ڈیڈی ہمیں کسی وقت بھی اس فون کے ذریعے خوشخبری سنا سکتے ہیں۔ تم ابھی رابطہ ختم کرو۔ ہم خود تمہیں فون کریں گے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ وہ سب پھر رحمت علی کے فون کا انتظار کرنے لگے۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ بے چینی بڑھ گئی پھر دو گھنٹے گزر گئے۔ برکت علی اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ بار بار دروازے کے باہر آ کر دیکھنے لگا۔ سلمان اور کامران کبھی اخبار پڑھ کر اور کبھی رسالوں کی ورق گردانی کر کے وقت گزار رہے تھے۔ نہ فون کی گھنٹی بج رہی تھی اور نہ رحمت علی واپس آ رہا تھا۔ وہ سب کوٹھی کے باہر آ کر دور دور تک نظریں دوڑانے لگے۔ اب انتظار تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے وقت کیا کرنا چاہیے۔

تین گھنٹے گزرنے کے بعد فون کی گھنٹی سنائی دی۔ وہ سب دوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ کامران نے اسپیکر آن کر کے کہا۔ "ہیلو میں کامران بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہم جناح اسپتال سے بول رہے ہیں۔ رحمت علی صاحب نے یہ فون نمبر دیا ہے۔ انہیں گولی لگی ہے۔ ابھی ہوش آیا ہے۔ آپ ادھر آ جائیں۔"

یہ بڑی شاک پہنچانے والی خبر تھی اور بالکل توقع کے خلاف تھی۔ حیات بیگم نے چھاتی پیٹ کر سلمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہائے میں مرجاؤں۔ انہیں کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔ اگر تم چلے جاتے تو کیا باپ ابھی اسپتال میں ہوتا؟ مگر تم چاہتے تھے کہ اپنی جان سلامت رہے۔ بلا سے باپ مرجائے۔"

کامران نے کہا۔ "ممی! آپ سلمان کو فضول الزام دے رہی ہیں۔ وہ تو بار بار جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ڈیڈی! اپنی مرضی سے رقم لے کر گئے تھے۔"

"اس کے دل میں باپ کے لیے درد ہوتا تو یہ انہیں ان کی مرضی سے بھی نہ جانے دیتا۔"

کامران نے کہا۔ "میں بھی ان کا بیٹا ہوں۔ میرے دل میں بھی ان کے لیے درد نہیں ہے۔ سارا درد آپ کے جگر میں ہے۔"

برکت نے غصے سے کہا۔ "تم لوگ بحث کرتے رہو گے یا اسپتال بھی چلو گے؟"

وہ اسپتال پہنچ گئے۔ رحمت علی جنرل وارڈ کے ایک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے بازو اور سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ ہوش میں تھا لیکن حواس میں نہیں تھا۔ اپنے بھائی' بیٹوں کو اور بیگم کو پہچان رہا تھا مگر پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی انہیں اور کبھی اسپتال کو دیکھ رہا تھا۔

پولیس والے بھی وہاں موجود تھے۔ ایک انسپکٹر اس کا بیان لینا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ بولنے کے قابل ہوا۔

اس نے بیان دیا کہ بلوچ کالونی کا چوراہا پار کرنے کے بعد اس کے برابر سے گزرتی ہوئی ایک کار سے اس پر فائرنگ ہوئی تھی۔ وہ پہلی گولی سے تو بچ گیا لیکن دوسری گولی اس کے بازو پر لگی۔ اسٹیئرنگ بہک گیا۔ کار فٹ پاتھ پر چڑھ کر رک گئی۔ وہ اخبار کا بنڈل اٹھا کر تکلیف برداشت کرتا ہوا کار سے نکل کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن پیچھے سے کسی نے کلاشنکوف کے دستے سے سر پر ضرب لگائی۔ وہ اوندھے منہ سڑک پر گر پڑا پھر اسے ہوش نہیں رہا کہ وہ کس عالم میں ہے۔ جب ہوش میں آیا تو خود کو اسپتال میں پایا۔

اس بیان سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ دہشت گرد رحمت علی کی کوٹھی سے ہی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے فون پر خاص طور سے یہ کہا تھا کہ رقم اخبار میں لپیٹ کر لائی جائے۔ یعنی یہ پہلے سے طے کرلیا تھا کہ راستے ہی میں رحمت علی پر حملہ کرکے وہ رقم چھین لی جائے گی اور رقم کی پہچان یہ ہوگی کہ وہ اخبار میں لپٹی ہوئی ہوگی۔

یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ وہ پچاس لاکھ روپے سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور حشمت علی کی واپسی غیر یقینی ہوگئی ہے۔ رحمت علی کو وہ رقم لے کر جہاں پہنچنا چاہیے تھا وہاں پہنچنے سے پہلے ہی جب رقم ہاتھ سے نکل گئی تھی اور مطالبہ کرنے والوں تک پہنچ نہیں پائی تھی تو پھر حشمت علی کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

برکت نے کہا۔ ”ہم تین گھنٹے تک گھر میں انتظار کرتے رہے۔ بھائی جان ان مطالبہ کرنے والوں تک نہیں پہنچ پائے۔ انہیں اس دوران ہمیں فون کرنا چاہیے تھا۔ وہ بھائی جان کے متعلق پوچھ سکتے تھے۔ رقم کا مطالبہ کرسکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے انہوں نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ مقررہ مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی رقم چھین لی ہے۔“

رقم گئی سو گئی۔ پریشانی اب حشمت علی کے لیے تھی کہ وہ کہاں ہیں؟ اور انہیں کس طرح ڈھونڈ کر لایا جاسکتا ہے؟ یہ ایک ذرا سی امید تھی کہ وہ دہشت گرد شاید پھر حشمت علی کے سلسلے میں رابطہ کریں گے۔ اس لیے وہ کوٹھی میں واپس آئے۔ حیات بیگم اپنے شوہر کے پاس اسپتال میں رہ گئی۔

برکت علی، سلمان اور کامران کوٹھی کے سامنے پہنچے تو قادر جان کوٹھی کے باہر کھڑا

رو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ابھی کسی نے فون کیا ہے کہ کھوکھراپار ریلوے لائن پر جہاں لین دین کی بات طے پائی تھی، وہاں انکل حشمت کی لاش پڑی ہے۔ ہم اسے اٹھا کر لے آئیں۔“

یہ سنتے ہی برکت علی کا سر چکرا گیا۔ سلمان اور کامران نے انہیں سہارا دیا۔ ڈرائنگ روم میں آکر قریبی تھانے میں فون کیا تاکہ وہ کھوکھراپار کے تھانے والوں سے کہہ دیں کہ اس لاش کے سلسلے میں جلد از جلد رپورٹ درج کرکے وہ لاش ان کے حوالے کر دی جائے۔

وہ جائے واردات پر پہنچے تو ریلوے لائن پر ایک لاش پڑی ہوئی ملی۔ اس کے چہرے اور جسم کے کئی حصوں کو تیزاب سے بگاڑ دیا گیا تھا۔ بدن پر جو لباس رہ گیا تھا اور جیب سے جو تسبیح برآمد ہوئی، اس سے پہچانا گیا کہ وہ حشمت علی کی لاش ہے اور انہیں بڑی اذیتیں دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔

یہ صدمہ کچھ کم نہیں ہوتا کہ کوئی اپنا ہلاک کر دیا جائے لیکن اسے اذیتیں دے کر ہلاک کیا جائے تو صدمہ اور بڑھ جاتا ہے۔ اگر ایسی درندگی کی جائے کہ لاش کو ناقابلِ شناخت بنا دیا جائے تو صدمے کی انتہا نہیں رہتی کیونکہ اس طرح ہلاک ہونے والے کا آخری دیدار بھی نہیں ہو پاتا۔ یہ دکھ ہمیشہ رہتا ہے کہ اپنے مرنے والے کو آخری بار جی بھر کے نہ دیکھ سکے۔

ان کی ہلاکت کی خبر پاکستان سے یو کے اور امریکا تک تمام رشتے داروں کو پہنچائی گئی۔ ان سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ ان سب کی آمد اور آخری رسومات میں ان کے شریک ہونے کا انتظار نہیں کیا جاسکے گا کیونکہ تیزاب کے باعث فوری تدفین لازمی ہے۔ تاہم انہیں لاہور لے جاکر آبائی قبرستان میں اپنے آباؤاجداد کی قبروں کے قریب دفن کر دیا گیا۔

رحمت علی اپنے خاندان والوں کے ساتھ لاہور آگیا۔ اس دوران میں کراچی جاتا آتا رہا۔ کوٹھی اور فیکٹری دونوں میں تالا لگا ہوا تھا لیکن ان کی دیکھ بھال ضروری تھی۔ سلمان اور کامران نے کہہ دیا تھا کہ وہ چالیس دن تک لاہور میں رہیں گے۔ آبرو لندن سے واپس آگئی تھی۔ بڑی سوگوار تھی۔ چپ چپ سی رہتی تھی۔ سلمان اور کامران اس کا دل بہلانے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔

عشرت بیگم نے اپنے بھانجے اور بھتیجوں کو سمجھایا کہ وہ بھی آبرو کا دل جیتنے کی

کوشش کریں۔ جب تک حشمت علی کا چالیسواں نہ ہوتا' تب تک عشرت بیگم یہ اعتراض نہیں کر سکتی تھی کہ سلمان اور کامران ان کی کوٹھی میں کیوں رہتے ہیں اور آبرو سے زیادہ کیوں گھلتے ملتے رہتے ہیں؟

ایک تو وہ سگے تھے پھر آبرو ان کے ساتھ ہی زیادہ وقت گزارتی تھی۔ ماں سے صاف کہہ دیتی تھی کہ اس کے جتنے خالہ زاد ماموں زاد ہیں' ان میں مینرز اور ایٹی کیٹس نہیں۔ حتیٰ کہ گفتگو کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔

عشرت بیگم نے پہلے اسے غصے سے سمجھایا۔ دھمکیاں بھی دیں لیکن سات سمندر پار سے آنے والی بیٹی کو مرعوب نہ کر سکی۔ پھر اسے پیار سے سمجھایا کہ وہ اپنے کسی خالہ زاد ماموں زاد کو اپنے مزاج کے مطابق طور طریقے سکھا کر اسے اپنے قابل بنا سکتی ہے۔

آبرو کی شادی اپنی مرضی سے کرنے کا مسئلہ صرف عشرت بیگم کا تھا پھر حیات بیگم کے سامنے بھی یہی مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اسے پتا چلا کہ سلمان اور کامران دونوں ہی آبرو کو چاہتے ہیں۔ آبرو کروڑوں کی دولت اور جائداد کی تنہا مالک بننے والی تھی۔ جس سے اس کی شادی ہو جاتی' وہ دولت کے معاملے میں بے تاج کا بادشاہ بن جاتا۔ حیات بیگم کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ سلمان بھی آبرو کے چاہنے والوں میں سے ایک تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے تھا کہ اس کے اپنے بیٹے کامران کا رقیب بن گیا تھا۔

عورت ایسی چیز ہے' جس کے ذریعے دو دوستوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنایا جا سکتا ہے۔ یہ حیات بیگم کے لیے بہترین موقع تھا وہ دونوں سوتیلے بھائیوں میں رقابت کی آگ بھڑکا کر ان کی دوستی کو دشمنی میں بدل سکتی تھی۔

اس نے کامران سے کہا۔ "بیٹے! میں دیکھ رہی ہوں کہ آبرو تمہیں پسند کرتی ہے۔ وہ میرے سامنے تمہاری بڑی تعریفیں کر رہی تھی۔"

"آپ نے دونوں کانوں سے نہیں سنا ہے۔ وہ سلمان کی بھی بڑی تعریفیں کرتی ہے۔ اسے بھی پسند کرتی ہے۔"

"یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ کیا یہ تمہیں اچھا لگتا ہے کہ جو تم سے محبت کرے' تمہاری دلہن بننا چاہے' اس سے سلمان بھی محبت کرے؟"

"محبت کرنے کا حق سب کو ہے۔ وہ بھی محبت کرتا ہے۔"

"تم کب تک بے وقوف بنتے رہو گے؟ کیا اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ جسے میں

اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں' اسے وہ کم بخت تم سے چھین لینا چاہتا ہے۔"

"ممی! ہم دونوں ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں۔ اس کی شادی جس سے بھی ہو گی' وہ آپ کی بہو کہلائے گی۔"

وہ غصے سے بھڑک کر بولی۔ "مگر میں آبرو کو تمہاری دلہن بنانا چاہتی ہوں۔"

"آپ کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ تو آبرو کی مرضی پر ہے۔ پتا نہیں' وہ کس کی دلہن بننا چاہے گی۔"

"وہ تمہاری دلہن بنے گی۔ میں نے قسم کھالی ہے۔ تم بچپن سے اب تک اپنی من مانی کرتے آئے ہو۔ اب نہیں کرنے دوں گی۔ میں جیسا کہتی ہوں' ویسا ہی کرو۔"

"میں آپ کے حکم کے مطابق ہر وہ کام کروں گا' جس سے سلمان کا دل نہ ٹوٹے۔"

"نہیں ٹوٹے گا۔ میں اس کے لیے بھی آبرو جیسی دلہن لاؤں گی۔"

"پھر تو کیا بات ہے ممی! آپ کا یہ بیٹا ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر آبرو سے شادی کرے گا۔ میں اور سلمان پچھلے دو برسوں سے آبرو کی ہم شکل تلاش کر رہے ہیں۔ اگر آپ کر چکی ہیں تو پھر بسم اللہ۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے؟ میں آبرو کی ہم شکل کہاں سے لاؤں گی؟"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ برکت چچا اور چچی بھی اس عمر میں دوسری آبرو پیدا نہیں کر سکیں گے۔"

وہ اسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں قسم کھا چکی ہوں' اسے تیری دلہن بنا کر رہوں گی۔"

"ممی! اس مسئلے کو رہنے دیں۔ آبرو کو اقوام متحدہ کی عدالت میں لے جائیں گی' تب بھی اسے کسی ایک کی دلہن نہیں بنا سکیں گی۔ آپ قسم کھا کر تقدیر سے نہیں لڑ سکیں گی۔"

"بیٹے! ابھی تم بچے ہو۔ بگڑی ہوئی تقدیر کس طرح بنائی جاتی ہے' ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں۔"

"ہم آپ کے بچے ہیں۔ بچے ہی رہیں گے۔ آپ سے سیکھ لیں گے کہ بگڑی کو کس طرح بنایا جاتا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ ڈیڈی کے ساتھ بار بار کراچی کیوں جاتی ہیں۔ آپ کو کم از کم چالیس دنوں تک یہاں رہنا چاہیے۔"

"تمہارا مستقبل بنانے جاتی ہوں۔ تمہارے ڈیڈی پھر سے فیکٹری کا کام شروع کر رہے ہیں۔"

"ممی! وہ فیکٹری دوبارہ زندہ نہیں ہو سکے گی۔ اس کے لیے لاکھوں روپے کی ضرورت ہے۔ ابھی ڈیڈی کے زخم نہیں بھرے ہیں۔ انہیں فضول جدوجہد سے پرہیز کرنا چاہیے۔ یہاں آرام کرنا چاہیے۔"

"بینک سے نوٹس آگیا تھا کہ قرضے کی رقم ادا نہ کی گئی تو فیکٹری اور کوٹھی کو نیلام کر دیا جائے گا۔ تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ انہوں نے بینک کا تمام قرضہ ادا کر دیا ہے۔ اب سب کچھ ہمارا ہے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "پچیس لاکھ روپے بینک سے لیے گئے تھے' ڈیڈی نے اتنی بڑی رقم کیسے ادا کر دی؟"

"بیٹے' یہ تو وہی جانتے ہیں کہ انہوں نے کتنی محنت اور حکمتِ عملی سے اتنی رقم کا انتظام کیا ہے کہ بینک کے قرضے سے بھی نجات مل گئی اور اب ہمارا کاروبار دوبارہ شروع ہو سکے گا۔"

"چچا جان سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے کہ ڈیڈی نے کس طرح بگڑے ہوئے حالات پر قابو پالیا ہے۔"

"بیٹے! ابھی چچا جان یا کسی بھی رشتے دار سے یہ نہ کہنا۔ پہلے ہمیں اچھی طرح پیروں پر کھڑا ہو جانے دو۔ تمہارے چچا جان سگے ہیں پھر بھی اندر سے خار کھاتے ہیں۔ وہ خوش نہیں ہوں گے۔ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔"

کامران نے اپنے چچا سے تو کچھ نہیں کہا لیکن سلمان سے حیرانی ظاہر کی۔ "یار! تعجب ہے' ڈیڈی نے بینک کا قرضہ ادا کر دیا ہے۔ پچیس لاکھ معمولی رقم نہیں ہوتی پھر یہ کہ کاروبار بھی شروع کر رہے ہیں اسی لیے ممی کے ساتھ کراچی جاتے رہتے ہیں۔ تو مجھ سے زیادہ کاروباری باتیں جانتا ہے' یہ بتا کہ اس فیکٹری کو دوبارہ شروع کرنے کے لیے ڈیڈی کتنی رقم لگا رہے ہیں؟"

"جب تک بیس بائیس لاکھ روپے نہ ہوں' وہ فیکٹری دوبارہ شروع نہیں ہو سکے گی۔ یہ تو واقعی عجیب بات ہے کہ ڈیڈی نے اتنی بڑی رقم حاصل کر لی ہے۔ تقریباً پچاس لاکھ روپے تو ضرور خرچ کر رہے ہوں گے۔"

ان بیٹوں کو یہ پورا حق حاصل تھا کہ وہ اندر کی بات معلوم کرتے۔ انہوں نے باپ سے پوچھا۔ "ڈیڈی! ہم سب پچھلے دنوں پریشان رہے۔ فیکٹری بند ہو گئی تھی۔ آپ نے اعلان کر دیا تھا کہ اب کاروبار کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے پھر اتنی بڑی رقم آپ نے کہاں سے حاصل کی ہے؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "بیٹے! کاروبار کرنا مجھ سے سیکھو۔ میں نے کالا دھن چھپا کر رکھا تھا۔ میری کوشش تھی' اسے ظاہر نہ کروں۔ برکت علی سے قرض لے کر ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا لوں۔ ابا جان سے بھی توقع تھی کہ وہ تمہارے چچا جان کو قرض دینے پر راضی کر لیں گے لیکن تم دونوں نے دیکھا کہ تمہارا چچا کیسا طوطا چشم ہے۔ وہ میری بربادی پر خوش تھا۔ اس نے میری مدد نہیں کی۔ ابا جان بھی اسے قرض دینے پر راضی نہ کر سکے۔"

حیات بیگم نے اپنے بیٹے کو تنہائی میں سمجھایا۔ "ان حالات سے تمہیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔ برکت تمہارے ڈیڈی کا سگا بھائی ہے۔ اس نے برے وقت میں بھائی کا ساتھ نہیں دیا اور تم ایسے احمق ہو کہ ابھی تک سوتیلے بھائی کو سگے سے زیادہ سمجھ رہے ہو۔ کیا تم اپنوں کی خود غرضیاں دیکھ کر بھی عقل سے کام نہیں لو گے؟"

"ممی! یہ درست ہے۔ سوتیلے دشمنی کریں تو زیادہ دکھ نہیں ہوتا کیونکہ وہ سوتیلے ہوتے ہیں لیکن سگے آنکھیں پھیر لیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے پھر یہ دکھ کم ہو جاتا ہے کہ کسی سوتیلے نے برے وقت میں ساتھ چھوڑ دیا ہے۔"

"تم یہ کیسی الجھی ہوئی باتیں کر رہے ہو؟"

"سیدھی سی بات کہہ رہا ہوں۔ کبھی سلمان سے تکلیف پہنچے گی تو یہ سوچ کر صبر آجائے گا کہ اس سے زیادہ تکلیف سگے بھائیوں سے پہنچتی ہے۔"

"میں تمہیں سمجھاتی کیا ہوں اور تم سمجھتے کیا ہو؟ کیا تم سلمان سے دھوکا کھانے کا انتظار کر رہے ہو؟ کیا اس کے بعد عقل آئے گی؟"

"اس دنیا کے تمام انسان غیر شعوری طور پر پیش آنے والی مصیبتوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ایسی کوئی مصیبت آئے گی تو دو ہی باتیں ہوں گی' میں مات کھا جاؤں گا یا اس مصیبت کو مات دے دوں گا۔"

حیات بیگم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر کہا۔ "میں تمہیں سمجھا نہیں سکتی۔ اللہ ہی تمہیں سمجھائے گا۔"

چالیس دن پورے ہو گئے۔ اس روز قرآن خوانی کرائی گئی اور مرحوم کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھا کر ان کی مغفرت کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ بہت سے عزیز و اقارب قبر پر حاضری دینے آئے تھے۔ فاتحہ خوانی کے بعد رحمت علی نے برکت سے کہا۔

"میں کل چلا جاؤں گا۔ پتا نہیں پھر کب واپسی ہو۔ میں چاہتا ہوں' ہم دونوں بھائی ابا جان کی قبر کے پاس تھوڑا سا وقت تنہائی میں گزار لیں۔ یہاں ہم دونوں ہوں گے اور ابا جان ہوں گے۔ کوئی چوتھا نہیں ہو گا۔"

برکت نے تمام عزیز و اقارب سے کہا۔ "آپ تمام حضرات میری کوٹھی میں چلیں۔ وہاں کچھ کھانے پینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہم دونوں بھائی ابا جان کے پاس تھوڑی دیر تنہا رہ کر ابھی آجائیں گے۔"

یہ مرحوم باپ سے وابستہ رہنے والے درد بھرے جذبات تھے اس لیے سب چلے گئے۔ اس وسیع و عریض قبرستان کی ویرانی میں دونوں بھائی تنہا رہ گئے۔ وہ دونوں شانہ بشانہ قبر کے پائنتی دو زانو........ ہو کر بیٹھ گئے۔ رحمت علی نے کہا۔ "ہمارے ابا جان نے ہم دونوں سے برابر محبت کی۔ اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے ہمارے درمیان برابر دولت اور جائداد تقسیم کی لیکن میں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ خواہ وہ ابا جان کی محبت ہو یا دولت۔ یعنی تم سے ناانصافی کرنا چاہتا تھا۔"

برکت نے کہا۔ "کوئی بات نہیں بھائی جان! آج آپ کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے اور یہ بہت اچھی بات ہے۔"

"تمہیں یاد ہے برکت! جب میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا تب ابا جان کے پچیس ہزار روپے چوری ہو گئے تھے۔ میں نے ایک ڈاکو کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے میری پیٹھ پر چھرا مار دیا تھا۔"

"ہاں یاد ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ زخم معمولی تھا اور آپ بچ گئے تھے۔"

"وہ زخم اس لیے معمولی تھا کہ میں نے خود اپنے آپ کو چھرا مارا تھا۔ پچیس ہزار روپے چوری کیے تھے اور ایک ڈاکو کی کہانی سنا دی تھی۔"

برکت علی نے حیرانی اور بے یقینی سے اپنے بھائی کو دیکھا پھر پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ رقم آپ نے چوری کی تھی؟"

"میں مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے ایک ضرورت کے تحت ابا جان سے صرف دس ہزار

مانگے تھے اور انہوں نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ میں ہیرا منڈی جانے لگا ہوں اور مُجرا کرنے والی پر رقم لٹانے لگا ہوں۔"

"آپ عجیب ہیں بھائی جان! آپ نے خود کو زخمی کیا۔ اس طرح کیا آپ کو تکلیف نہیں ہوئی؟"

"تکلیف تو ہوتی ہے۔ دولت حاصل کرنے کے لیے بڑی سے بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اور جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ وہ تو صرف پچیس ہزار کے لیے میں نے خود کو چھرا مارا تھا۔ اس بار پچاس لاکھ روپے کے لیے بازو پر گولی کھائی تھی اور سر پر چوٹ بھی برداشت کی۔"

برکت اسے شدید حیرانی سے تکنے لگا۔ رحمت نے کہا۔ "اور یہ تکلیف تمہاری وجہ سے اٹھانی پڑی۔ اگر تم مجھے قرض دے دیتے تو میں بڑے آرام سے کاروبار شروع کر سکتا تھا۔ خواہ مخواہ ابا جان کو اغوا نہ کرانا پڑتا۔"

برکت غصے سے بپھر گیا۔ گرج کر بولا۔ "آپ نے ایک محبت کرنے والے باپ کو اغوا کرایا اور اس بات کی پروا نہیں کی کہ پچاس لاکھ کی بے ایمانی کریں گے تو دہشت گرد ابا جان کو ہلاک کر دیں گے۔"

"برکت! ذرا آہستہ۔ اس قبرستان کے سناٹے میں چیخو گے' چلاؤ گے تو دور تک آواز جائے گی۔ مُردے تو نہیں آئیں گے۔ مُردوں پر فاتحہ پڑھنے والے یہاں آکر بھیڑ لگائیں گے پھر اس بھیڑ میں تمہیں یہ خوش خبری نہیں سنا سکوں گا کہ ہمارے پیارے ابا جان زندہ ہیں۔"

"کیا؟" برکت ایک دم سے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا پھر اس نے قبر کو دیکھا اور بے یقینی سے پوچھا۔ "ابا جان زندہ ہیں؟"

"زندہ ہیں۔ بڑی تکلیف میں ہیں۔ تمہیں یاد کر رہے ہیں۔"

وہ رحمت کے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "بھائی جان! آپ کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں' سچ بولیں۔ کیا واقعی ابا جان زندہ ہیں؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں' وہ زندہ ہیں۔ میرے ساتھ کراچی چلو۔ انہیں جہاں قید کیا گیا ہے' وہاں ان سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"آج ہی چلیں۔ ابھی چلیں۔ ہم ابھی کراچی جائیں گے۔"

"جلدی نہ کرو۔ میں کل صبح کی فلائٹ میں تمہارے لیے بھی ایک ٹکٹ لے چکا ہوں۔"

"یہ کس کی قبر ہے؟"

"پتا نہیں' یہ کون بدنصیب ہے۔ میں نے جن دہشت گردوں سے دو لاکھ روپے میں معاملات طے کیے تھے' انہیں تاکید کی تھی کہ ابا جان کو جانی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ انہوں نے کسی دوسرے شکار کو مار کر اسے ابا جان کا لباس پہنایا اور اس کی جیب میں تسبیح رکھ دی۔"

وہ بتانے لگا۔ جن لوگوں نے اس پر فائرنگ کی تھی' وہ سب زر خرید بدمعاش تھے۔ یہ پہلے سے طے پاچکا تھا کہ بلوچ کالونی کے چوراہے پر اس پر حملہ کیا جائے گا۔ رحمت علی کا سالا قادر جان بظاہر گھر میں تھا۔ اس نے برکت' سلمان' کامران اور حیات بیگم کو چائے بھی پلائی تھی لیکن آدھے گھنٹے کے بعد گھر کے ضروری کام سے باہر چلا گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس وقت جائے واردات پر پہنچنا ہے۔ اس نے ٹھیک اسی وقت ایک گاڑی میں بیٹھ کر جائے واردات پر پہنچ کر حملہ کرنے والوں سے اخبار کا بنڈل لیا' جس میں پچاس لاکھ روپے تھے پھر اس نے واپس آکر کوٹھی کے پچھلے دروازے سے بہن کے کمرے میں پہنچ کر وہ رقم چھپا دی تھی۔

برکت سر جھکائے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ نے پچاس لاکھ کا فراڈ کیا ہے۔ میں اس رقم کی بات بعد میں کروں گا۔ پہلے یہ بتائیں آپ نے اباجان کو کہیں حبسِ بے جا میں کیوں رکھا ہے؟"

"مجھے افسوس ہے' میں ابا جان کے سلسلے میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔ تم وہاں جا کر اپنے تمام سوالات کے جواب معلوم کرلو گے۔ اس سے پہلے ایک عقل کی بات سمجھا دوں کہ اپنے سائے سے بھی یہ نہ کہنا کہ وہ زندہ ہیں۔ خاندان والے اور پولیس والے میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ پھر تم سمجھ سکتے ہو کہ اپنے بچاؤ کے لیے اس بے چارے باپ کو قتل کرنا ہی ہو گا۔ اس کے بعد وہ کبھی زندہ دکھائی نہیں دیں گے پھر سب ہی کو تسلیم کرنا ہو گا کہ یہی ابا جان کی قبر ہے۔"

برکت قبر کے پاس سے اٹھ گیا۔ سر جھکا کر وہاں سے آہستہ آہستہ بوجھل قدموں

سے واپس جانے لگا۔ اسے اپنے کمینے اور کم ظرف بھائی سے توقع نہیں تھی کہ وہ اپنے بوڑھے باپ پر ترس کھا کر اسے لاہور واپس لے آئے گا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ یہ بات سمجھ میں آرہی تھی۔ وہ لالچی اور خود غرض تھا۔ چھوٹے بھائی کی دولت پر نظر تھی۔ وہ اس بار کچھ زیادہ ہی رقم وصول کرنا چاہتا ہو گا۔

رحمت علی نے اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھول کر خود بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ گاڑی مجھے چلانے دو۔ آؤ میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔"

برکت اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رحمت کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھتے ہوئے فاتحانہ انداز میں سوچ رہا تھا۔ میرے پیارے بھائی! اب میں صرف کار کی نہیں' تمہاری زندگی کی اسٹیئرنگ بھی اپنے ہاتھوں میں رکھوں گا اور جدھر چاہوں گا' ادھر اسے موڑتا رہوں گا۔

☆======☆======☆

لالچ انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ یہ کہاوت بہت پرانی ہے اس لیے لوگ پرانی باتوں کو فرسودہ سمجھ کر چھوڑتے جا رہے ہیں۔ نئی بات یہ ہے کہ جتنا لالچ کیا جائے گا' اتنے ہی دولت کمانے کے راستے نکلتے جائیں گے۔

برکت علی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اسے عارضی طور پر اندھا بنا دیا گیا تھا تاکہ وہ باپ تک پہنچنے کے راستے نہ دیکھ سکے۔ رحمت علی اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار کے شیشے کلرڈ تھے۔ باہر سے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا کہ کسی کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔

قادر جان ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا پھر کار کا اگلا دروازہ کھلا۔ خوشبو کا ایک جھونکا سا آیا۔ برکت نے پرفیوم کی مہک سے سمجھ لیا کہ حیات بیگم اگلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی ہے پھر وہ قافلہ اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

کافی لمبی ڈرائیو تھی۔ برکت نے اندازہ کیا کہ وہ شہری ٹریفک کے ہنگاموں سے دور نکل آئے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی قریب سے گزر جاتی تھی ورنہ خاموشی رہتی تھی۔ کسی انسانی آبادی سے آنے والی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔

تقریباً تین گھنٹے گزر گئے پھر وہ کار ایک جگہ رک گئی۔ رحمت نے کار کا دروازہ کھول کر برکت کا ہاتھ پکڑ کر اسے کار سے اتارا پھر اسے سہارا دے کر اپنے ساتھ لے جانے لگا۔

وہ دونوں ایک مکان میں داخل ہوئے پھر اس مکان کے اندر چلتے چلتے ایک جگہ رک گئے۔ چوہدری حشمت علی کی آواز سنائی دی۔ ان کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "برکت! میرے بیٹے........."

برکت نے تڑپ کر اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ رحمت نے اسے نہیں روکا۔ حشمت علی ایک پرانی چارپائی پر تھے۔ اس چارپائی کی رسیاں اتنی ڈھیلی تھیں کہ وہ دھنسے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہاں سے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ برکت نے سہارا دے کر اٹھایا پھر انہیں سینے سے لگا کر رونے لگا۔

دونوں باپ بیٹے کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ باپ نے کہا۔ "بیٹے! تمہارا فولاد کا کارخانہ ہے۔ خود بھی فولاد ہو۔ کیا فولاد کبھی روتے ہیں؟"

"ابا جان! آپ کی موجودہ حالت پر نہیں رو رہا ہوں۔ اللہ کی قسم آپ کو زندہ پا کر خوشی سے آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں۔"

رحمت ایک پرانی کرسی پر بیٹھا' باپ بیٹے کا جذباتی ملاپ دیکھ رہا تھا اور چیونگم چبا رہا تھا۔ برکت نے کہا۔ "بھائی جان! یہاں سے اٹھیں۔ اباجان کو ذرا آرام سے کرسی پر بیٹھنے دیں۔ یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ جس چارپائی کی رسیاں ڈھیلی ہیں' وہاں آپ ابا جان کو بٹھاتے اور لٹاتے ہیں۔"

رحمت نے کہا۔ "انسان کی زندگی میں دکھ سکھ آتے رہتے ہیں۔ تم چاہو گے تو ابا جان کے یہ سارے دکھ ختم ہو جائیں گے۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"میں تم سے ایک بھائی کی محبت چاہتا ہوں۔ ایسی محبت جو کبھی نہ ٹوٹے' ہمیشہ پائیدار رہے۔"

"کھل کر بولیں۔"

"آبرو کو میری بہو بنا دو۔ وہ میرے ایک بیٹے کی دلہن بن جائے گی تو مال و دولت کا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔"

"بھائی جان! آپ بہت بے وقوف ہیں۔ یہ تو میں خود چاہتا ہوں کہ مجھے ایسا داماد ملے' جو میری طرح کاروباری ذہانت رکھتا ہو۔ مجھے شروع ہی سے سلمان پسند ہے۔"

رحمت نے کہا۔ "سلمان نہیں' آپ کامران کو داماد بنائیں گے۔"

"آپ کے منہ سے بھائی جان کی زبان بول رہی ہے۔ کیا سلمان آپ کا بیٹا نہیں ہے؟"

"اسے میری بیگم کی مرضی یا ضد سمجھ لو۔ تمہاری بیٹی کامران کی دلہن بنے گی۔"

"میں ابا جان کی سلامتی اور رہائی کے لیے آپ کی تمام باتیں مان سکتا ہوں لیکن آپ بھی ذرا عقل سے کام لیں۔ کامران کو کاروبار سے دلچسپی نہیں ہے۔ وہ میرے پھلتے پھولتے کاروبار کو ڈبو دے گا۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ تم جانتے ہو' دونوں سوتیلے بھائیوں میں سگوں سے زیادہ محبت ہے۔ سلمان جنرل مینیجر کی حیثیت سے تمہارے کاروبار کو سنبھالے گا۔"

برکت نے اپنے باپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ رحمت نے کرسی سے اٹھ کر کہا "ابا جان! یہاں تشریف رکھیں اور آرام سے فیصلہ سنائیں۔"

چوہدری حشمت علی نے کہا۔ "اب بھی میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم ہے کہ میں تمہاری عدالت میں ایک ملزم کی طرح کھڑا رہ سکتا ہوں۔ مجھے اس بات کا صدمہ ہے کہ میں تمہارے جیسے کمینے اور کم ظرف کا باپ ہوں۔"

"ابا جان! مجھے برا کہنے سے کسی کا بھلا نہیں ہو گا۔ یہ سچے قصے ہماری تاریخ میں موجود ہیں کہ بیٹوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے' سر پر تاج پہننے کے لیے' باپ کو قتل کر کے تخت نشیں ہو کر حکومتیں کی ہیں۔ میری اعلیٰ ظرفی دیکھیں کہ میں نے آپ کو زندہ رکھا ہے۔"

"ہاں۔ یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے کہ تم نے ہمارے مزاج کے خلاف کوئی مطالبہ نہیں کیا ہے۔ میں نے اور برکت نے بہت پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ آبرو کو سلمان کی دلہن بنایا جائے گا لیکن حیات بیگم اسے اپنے بیٹے کی دلہن بنانا چاہتی ہے۔ کوئی بات نہیں کامران بھی ہمارا خون ہے پھر یہ کہ وہ سلمان کے زیر اثر رہتا ہے۔ ہمارے کاروبار کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

برکت نے کہا۔ "ہم آپ کا مطالبہ مان رہے ہیں' آپ بھی تحریری معاہدہ کریں گے کہ آبرو اور کامران کی شادی کے بعد سلمان کو میرے کاروبار میں مداخلت سے نہیں روکا جائے گا اور وہ جنرل مینیجر کی حیثیت سے تمام کاروبار سنبھالے گا۔"

"یہ فضول سی شرط ہے۔ تمہارے کاروبار کا مالک تمہارا داماد کامران ہو گا۔ ہم

کامران کو گائیڈ کرتے رہیں گے۔ سلمان کو بے جا مداخلت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

حشمت علی اور برکت علی نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر برکت علی نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ایسا کوئی تحریری معاہدہ نہیں ہو گا۔"

"تحریری معاہدہ یہ ہو گا کہ تم اپنی بیٹی کو جہیز میں اپنا فولاد کا کارخانہ دے رہے ہو۔"

"کیا آپ مجھے کنگال بنا دینا چاہتے ہیں؟"

"میں ایسا ظالم بھی نہیں ہوں۔ تم اپنے لیے جائداد کا کچھ حصہ رکھ سکو گے۔"

ان کے درمیان تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ وہ سوچتے رہے پھر برکت نے کہا۔

"ساری دنیا جان چکی ہے کہ ابا جان ہلاک ہو چکے ہیں۔ ان کی قبر بھی موجود ہے۔ کیا انہیں دوبارہ خاندان والوں کے سامنے لائیں گے تو آپ کا جرم سامنے نہیں آئے گا؟"

"میں کسی طور مجرم نہیں کہلاؤں گا۔ میں تو اسپتال میں زخمی تھا۔ تم وہ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد لائے تھے۔ تم نے دھوکا کھایا تھا کہ وہ ابا جان کی لاش ہے۔ ابا جان سب کے سامنے آ کر بیان دیں گے کہ دہشت گردوں نے دوبارہ بھاری رقم وصول کرنے کے لیے کسی لاش کو ناقابلِ شناخت بنا کر ہمیں دھوکا دیا تھا۔ دوسری بار پھر تاوان کی رقم ادا کر کے انہیں رہائی دلائی گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ آج چل کر تحریری معاہدہ کریں اور ابا جان کو رہا کر دیں۔"

"مجھے ایسا احمق نہ سمجھو۔ پہلے معاہدہ ہو گا پھر آبرو اور کامران کا نکاح پڑھایا جائے گا۔ وہ دونوں ہنی مون کے لیے ملک سے باہر جائیں گے پھر ابا جان کو خاندان والوں کے سامنے لایا جائے گا۔"

"ان کاموں میں کافی دن گزر جائیں گے۔ میں ابا جان کو یہاں اس حالت میں نہیں چھوڑنا چاہتا۔"

"نکاح چند منٹوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ تم جتنی جلدی کرو گے' اتنی جلدی ابا جان کو رہائی مل جائے گی۔"

حشمت علی نے کہا۔ "کچھ تو عقل کی بات کرو۔ آبرو کسی معمولی گھرانے کی لڑکی نہیں ہے کہ اچانک نکاح پڑھوا کر اسے رخصت کر دیا جائے۔ پہلے رشتے کی بات چلتی ہے پھر منگنی ہوتی ہے۔ باقاعدہ رسم و رواج پر عمل کیا جاتا ہے پھر لڑکی کو دلہن بنا کر رخصت

کیا جاتا ہے۔"

"آپ کی مرضی ہے۔ آپ اس نیک کام میں جتنے دن اور مہینے گزارنا چاہیں' گزار سکتے ہیں۔ اتنے عرصے تک آپ یہیں رہیں گے۔"

حشمت علی نے کہا۔ "تم بچپن سے جانتے ہو کہ میں اپنی زبان سے نہیں پھرتا۔ جب میں زبان دے چکا ہوں کہ تمہارا مطالبہ پورا کیا جائے گا تو تمہیں اپنے باپ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ میں اپنے پوتے پوتی کی خوشیوں میں شریک رہوں؟"

"میں نہیں چاہتا۔ یہ سیدھی سی بات ہے۔ پہلے تحریری معاہدہ ہو گا پھر شادی ہو گی۔ وہ دونوں ہنی مون کے لیے ملک سے باہر جائیں گے۔ اس کے بعد ہمارے ابا جان سب کے سامنے آئیں گے۔"

"ہماری کوشش ہو گی کہ جلد سے جلد شادی ہو جائے پھر بھی کچھ تو وقت لگے گا۔ آپ اس وقت تک ابا جان کو کسی آرام دہ مکان میں رکھ سکتے ہیں۔"

"یہ آرام سے رہیں گے تو تم مطمئن رہو گے۔ یہ تکلیف میں رہیں گے تو تم انہیں آرام سے لے جانے کے لیے جلد سے جلد میرا مطالبہ پورا کرو گے۔"

پھر رحمت نے رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ واپس چلو۔"

برکت آگے بڑھ کر باپ کے سینے سے لگتے ہوئے بولا۔ "آپ اطمینان رکھیں' میں جلد سے جلد آپ کو یہاں سے لے جاؤں گا۔"

وہ باپ سے الگ ہوا تو قادر جان نے آ کر پھر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔

☆======☆======☆

برکت نے لاہور پہنچ کر خاندان کے افراد کو بتایا کہ دوسرے دن جمعے کی شام کو آبرو کا نکاح کامران سے پڑھا دیا جائے گا۔ یہ چونکا دینے والا اعلان تھا۔ عشرت بیگم کو یہ رشتہ منظور نہ تھا۔ برکت نے کہا۔ "یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ تمہیں منظور نہیں ہے تو میکے چلی جاؤ۔ میرے فیصلے کے آگے رکاوٹ بنو گی تو میں تمہیں طلاق بھی دے سکتا ہوں۔"

عشرت بیگم نے شوہر کے تیور کو سمجھ لیا کہ وہ جو کہہ رہا ہے' کر گزرے گا اس لیے وہ شوہر سے صرف ناراض ہو کر رہ گئی۔ آبرو نے پوچھا۔ "آپ میری مرضی معلوم کیے بغیر یہ فیصلہ کیوں کر رہے ہیں؟ میں کامران کو نہیں' سلمان کو جیون ساتھی بنانا چاہتی

ہوں۔"

"میں بھی سلمان کو ہی داماد بنانا چاہتا تھا لیکن میں مجبور ہوں۔ میں چاہتا ہوں' تم کوئی سوال کیے بغیر یہ رشتہ منظور کرلو۔"

"کیا آپ نے مجھے بے زبان رہنے اور اندھی زندگی گزارنے کے لیے تعلیم دلائی ہے؟"

"بیٹی! میں ایسے حالات سے گزر رہا ہوں کہ تم یہ شادی نہیں کرو گی تو میں مرجاؤں گا۔"

"پلیز ایسی باتیں نہ کریں۔ میری شادی سے آپ کی زندگی یا موت کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"میں مجبور ہوں۔ کچھ بتا نہیں سکتا۔ اگر دو چار روز میں تمہاری شادی کامران سے نہ ہوئی تو میں مرجاؤں گا۔ تمہیں اپنے دادا جان کے بعد میری موت کا صدمہ برداشت کرنا ہو گا۔"

آبرو اپنے باپ کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

دوسری طرف حیات بیگم اور رحمت علی کے لیے مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ کامران نے صاف کہہ دیا تھا کہ اس کی ایک آئیڈیل آبرو ہے جو اس کے تخیل میں آتی ہے وہ اسی آبرو سے شادی کرے گا۔ چچا جان کی بیٹی آبرو سے سلمان کی شادی کرا دی جائے۔

یہ سراسر پاگل پن والی باتیں تھیں۔ حیات بیگم نے کہا۔

"میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ تم آبرو کو چاہتے ہو۔ اس کی تصویریں بناتے ہو لیکن سلمان کی خاطر اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔"

رحمت علی نے کہا۔ "بیٹے! ہم تمہیں بہت امیر کبیر بنانا چاہتے ہیں۔ تمہاری خاطر ہم نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ بڑی محنت کی ہے۔ ہماری محبت اور ہمارے جذبات کو سمجھو۔"

"ڈیڈی! یہی شکایت مجھے آپ دونوں سے ہے۔ آپ محبت اور جذبات کو نہیں سمجھتے ہیں۔ شادی کرنے سے آئیڈیل مرجاتی ہے۔ بیوی بن جاتی ہے پھر بچوں کی ماں بنتی چلی جاتی ہے۔ ایک فنکار اپنے تخلیقی شاہکار کو اس طرح نہیں بگاڑتا' جس طرح شادی کے بعد آپ لوگ بگاڑ دیتے ہیں۔"

رحمت نے گرج کر حیات بیگم سے کہا: "تم نے کس پاگل کے بچے کو پیدا کیا ہے؟ ہماری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں اور اس کی بکواس سمجھنے کے لیے ہمیں گھی پینا پڑے گا۔ یہ میری تمام محنتوں پر پانی پھیر رہا ہے۔ یاد رکھو' اگر یہ راضی نہ ہوا تو پھر آبرو کو سلمان کی دلہن بنا کر لانا پڑے گا۔ میں اس پاگل کی وجہ سے جیتی ہوئی بازی نہیں ہاروں گا۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ حیات بیگم بیٹے کو بے بسی سے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔ "ممی! میں آپ کو کبھی دکھ نہیں پہنچانا چاہتا۔ آپ سمجھ نہیں سکتیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں لیکن آپ مجھے ایسی باتیں کرنے اور ایسی حرکتیں کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں' جن کے نتیجے میں آپ کو دکھ پہنچتا ہے۔"

"میں کوئی غلط بات نہیں کرتی ہوں۔ ہمیشہ تمہیں فائدہ پہنچانے کی بات کرتی ہوں۔"

"میں ایسا فائدہ نہیں چاہتا' جس سے سلمان کو نقصان پہنچے۔"

"آبرو سے تمہاری شادی ہو گی تو سلمان کو کیا نقصان پہنچے گا؟ کیا تم آبرو کو نہیں چاہتے ہو؟"

"میں کہہ چکا ہوں' آبرو میری آئیڈیل ہے اور آئیڈیل کو بیوی بنانے والے احمق ہوتے ہیں۔ آئیڈیل کے حسن اور اس کی معنویت کو ختم کر دیتے ہیں۔"

وہ ماں کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولا۔ "آپ میری بہت اچھی ممی ہیں۔ میری یہ ایک بات مان لیں۔ آبرو کو سلمان کی دلہن بنا کر لے چلیں۔"

اس نے بیٹے کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے' ماں کو بیٹے کے سامنے جھکنا ہی ہو گا۔ تم میری ایک بات مانو پھر میں تمہاری بات مان لوں گی۔"

"میں ضرور مانوں گا۔ آپ حکم دیں۔"

"آج ہم ماں بیٹے کہیں باہر جا کر لنچ کریں گے۔ تم تینوں وقت سلمان کے ساتھ کھاتے پیتے ہو۔ آج صرف میرے ساتھ کھاؤ گے۔"

"مجھے منظور ہے۔ میں سلمان سے کہہ کر آتا ہوں کہ آج وہ تنہا لنچ کرے۔ میں آپ کے ساتھ لنچ کروں گا۔"

"ٹھیک ہے میں ابھی چینج کر کے آتی ہوں۔"

وہ بیٹے سے الگ ہو کر اپنے کمرے میں آئی۔ اس نے قادر جان کو بلایا پھر سرگوشی میں کہا "میں کامران کو ساتھ لے جا رہی ہوں۔ سلمان آج تنہا کھانا کھائے گا۔ تم آخری حربہ استعمال کرو لیکن ذرا ہوشیاری سے۔ یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ یہاں برکت کے رشتے دار زیادہ ہیں۔ کوئی غلطی نہ کرنا۔"

وہ حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ حیات بیگم لباس تبدیل کر کے کامران کے ساتھ کار میں چلی گئی۔ سلمان کمرے میں تنہا تھا۔ ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ آبرو نے آ کر کہا۔ "کامران اپنی ممی کے ساتھ گیا ہے۔ کیا آج ماں بیٹے کی محبت دوستی پر غالب آ گئی ہے؟"

سلمان نے مسکرا کر کہا۔ "آؤ بیٹھو۔ وہ دوستی ہی کی خاطر ممی کے ساتھ گیا ہے۔ اپنی ممی کو تقریباً راضی کر چکا ہے کہ تم میری دلہن بنو گی۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "کامران کا جواب نہیں ہے۔ واقعی دوستی کا حق ادا کر رہا ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دوستی کی خاطر ممی کے ساتھ کہاں گیا ہے؟"

"لنچ کے لیے۔ ممی نے اس سے کہا ہے کہ وہ ان کے ساتھ لنچ کرے گا تو وہ تمہیں میری دلہن بنانے پر راضی ہو جائیں گی۔"

"تعجب ہے۔ بیٹے کے ساتھ لنچ کرنے کی خاطر وہ اتنی بڑی بات مان رہی ہیں جس کے لیے سختی سے انکار کرتی آ رہی تھیں۔"

ملازم نے آ کر سلمان سے پوچھا۔ "آپ کے لیے کھانا لے آؤں؟"

سلمان نے آبرو کی طرف جھک کر پوچھا۔ "آج تنہا ہوں' ساتھ دو گی؟"

آبرو نے ملازم سے کہا۔ "جاؤ۔ کھانا لے آؤ۔"

وہ چلا گیا۔ آبرو نے اپنی بات دہرائی۔ "کیا تم حیران نہیں ہو کہ وہ ہماری شادی کرانے کے راضی ہو گئی ہیں؟"

"ممی اور ڈیڈی تمہیں بہو بنا کر چچا جان کے تمام کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ کامران کے ذریعے وہ مقصد پورا نہیں ہو رہا ہے اس لیے وہ ہماری شادی پر راضی ہو گئی ہیں۔ آخر میرے ذریعے بھی تمہاری دولت اور جائداد ان کے گھر آئے گی۔"

"ویسے یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ چچا جان اور چچی جان بہت ہی لالچی ہیں۔ پتا نہیں تم اور کامران اس گھر میں کیسے پیدا ہو گئے؟"

ملازم ایک ٹرالی میں کھانا لے آیا۔ وہ دونوں کھانا کھانے کے دوران باتیں کرنے لگے۔ گفتگو کا موضوع اپنے بزرگ تھے کہ وہ جیسے بھی ہوں' محترم ہوتے ہیں۔ اگر بزرگوں سے غلطی ہو جائے تو ضروری نہیں کہ اولاد بھی ان کے نقشِ قدم پر چل کر وہی غلطی کرے۔ غلطی سے بچنے والوں کو اور اچھا عمل کرنے والوں کو اچھا نتیجہ ضرور ملتا ہے۔

کھانے کے بعد ایک بوڑھا ایک ٹرے میں دو گلاس نمکین لسی کے لے کر آیا۔ ان کے سامنے ٹرے رکھ کر بولا۔ "بی بی جی! جب آپ پیدا نہیں ہوئی تھیں تب سے میں اس گھر کا ملازم ہوں۔"

آبرو نے کہا۔ "ہم نے کبھی آپ کو ملازم نہیں سمجھا۔ بات کیا ہے؟"

"آج میری وفاداری کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ ان کے ماموں قادر جان نے مجھے دس ہزار روپے دیئے ہیں۔"

"اچھا! وہ کس لیے؟"

"سلمان صاحب کی لسی میں زہر ملانے کے لیے۔"

آبرو اور سلمان نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ملازم نے کہا۔ "میں نے اس گھر میں رہ کر اپنی تین بیٹیوں کی شادیاں کرائیں۔ میرے دو بیٹے آپ کی اسٹیل مل میں ملازم ہیں اور بڑے خوش حال ہیں۔"

"قادر جان نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم اس کا کام کرو گے؟"

"وہ کل سے مجھ پر مہربان تھا اور کچھ ایسی باتیں کر رہا تھا جیسے مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا ہو۔ میں نے خود کو ویسا ہی ظاہر کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے اپنی ایک بیٹی کی شادی کرنی ہے۔ دس ہزار روپے کی کمی ہے۔ میں دس ہزار حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اس نے فوراً ہی دس ہزار نکال کر مجھے دیئے اور یہ شیشی دی۔ اس میں زہر ہے۔"

اس بوڑھے نے شیشی اور ہزار ہزار کے دس نوٹ نکال کر آبرو کے سامنے رکھ دیے۔ آبرو نے انہیں دیکھا پھر کہا۔ "سلمان! یہ کیا ذلالت ہے؟ کیا انسان اتنا گر جاتا ہے؟"

سلمان نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "آج میری زندگی کا آخری دن تھا۔ بوڑھے بابا کی وفاداری نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔"

آبرو نے بوڑھے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ نے صرف سلمان پر ہی نہیں، مجھ پر بھی احسان کیا ہے۔ آپ جائیں، کسی سے کچھ نہ کہیں۔ میرے ابو کو یہاں بلا کر لے آئیں۔"

وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد برکت علی کے ساتھ آیا۔ آبرو نے اپنے باپ کو بتایا کہ سلمان کی جان لینے کی کس طرح کوشش کی گئی اور ایسا کس نے کیا ہے؟

برکت نے ریسور اٹھا کر آئی جی آف پولیس سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "میں آپ کو والد صاحب کے متعلق بہت کچھ بتا چکا ہوں۔ آج آپ ایک مجرم قادر جان کو گرفتار کرکے اس سے بہت کچھ اگلوا سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے آدمی سادہ لباس میں آکر اسے لے جائیں تاکہ کسی کو اس کی گرفتاری کا شبہ نہ ہو۔ میرا ایک بوڑھا ملازم قادر جان کی نشان دہی کرے گا۔ اس کے بعد میں آپ کے پاس آؤں گا۔"

برکت نے ریسیور رکھ کر بوڑھے ملازم سے کہا۔ "بابا! تم جاؤ اور قادر جان کو یقین دلاؤ کہ تم نے زہریلی لسی سلمان تک پہنچا دی ہے۔ جب وہ سادہ لباس والے آئیں تو اس شیطان کو ان کے حوالے کر دینا۔"

بوڑھا ملازم چلا گیا۔ برکت نے سلمان سے کہا۔ "جب تک اسے پولیس والے نہ لے جائیں، تم اسی کمرے میں رہو۔ کسی سے یہ نہ کہنا کہ تمہیں زہر دینے کی کوشش کی گئی تھی۔"

قادر جان کوٹھی کے پیچھے سرونٹ کوارٹر کے پاس کھڑا ہوا تھا اور جو چاہتا تھا اس کے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ بوڑھا ملازم بظاہر سہما ہوا سا اس کے پاس آیا۔ قادر جان نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ بولا۔ "میں نے لسی کا گلاس سلمان صاحب کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ جیسے ہی اسے اٹھا کر پینے لگے، میں کمرے سے چلا آیا۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے؟"

"فکر نہ کرو۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ تم کہہ دینا، ایک ہی جگ میں بنائی ہوئی لسی دوسروں کو بھی پینے کو دی تھی اور وہی لسی سلمان کو دی تھی پھر اسے کس نے زہریلی بنا دیا۔ یہ تم نہیں جانتے ہو۔"

ملازم نے کہا۔ "آپ میرے کوارٹر میں آجائیں۔ باہر کھڑا رہنا مناسب نہیں ہے۔

ابھی کوٹھی سے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں گی۔"

وہ کوارٹر کے اندر آکر بولا۔ "تمہیں کوٹھی میں رہنا چاہیے۔"

"میرا کچن کا کام ختم ہو چکا ہے۔ میں تو آپ کے ساتھ رہوں گا۔"

"میرے ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔ تم پر کوئی الزام آئے گا تو مجھ پر شبہ کیا جائے گا۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں پکڑا جاؤں اور آپ بچ جائیں؟ نہیں، ہم دونوں بچیں گے یا دونوں پکڑے جائیں گے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ یاد رکھو اگر پکڑے جاؤ تو میرا نام نہ لینا۔ میں بچ کر رہوں گا تو تمہیں بھی پولیس والوں سے بچا لوں گا۔"

بوڑھا ملازم اسے باتوں میں لگائے ہوئے تھا۔ ایسے وقت چار سادہ لباس والے وہاں آئے پھر ان دونوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ قادر جان ان سے پوچھتا ہی رہ گیا۔ جواب میں ایک افسر نے اپنا کارڈ دکھایا لیکن گرفتاری کی وجہ نہیں بتائی۔ دونوں کو ایک گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔

حیات بیگم بیٹے کے ساتھ لنچ کرکے واپس آئی تو اسے توقع تھی کہ سلمان کی موت کے باعث کوٹھی میں کہرام مچا ہو گا یا وہاں کا ماحول سوگوار ہو گا لیکن ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ وہ پورچ میں کار سے اتر کو کوٹھی کے اندر آئی۔ وہاں جو افراد تھے، وہ معمول کے مطابق ہنستے بولتے یا اپنے کسی کام میں مصروف دکھائی دیئے پھر وہ ایک کمرے میں پہنچی تو سلمان کا قہقہہ سن کر ٹھٹک گئی۔ وہ آبرو کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھا کسی بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔

اس نے کامران سے کہا۔ "تم ممی کے ساتھ لنچ کرنے گئے تھے۔ میں نے یہاں آبرو کے ساتھ مزے دار کھانے......... کھائے ہیں اور لسی بھی پی ہے۔"

حیات بیگم تیزی سے چلتی ہوئی کوٹھی کے مختلف حصوں میں قادر جان کو تلاش کرنے لگی۔ رشتے داروں اور ملازموں سے اس کے بارے میں پوچھا۔ سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ احاطے والے گیٹ کے چوکی دار نے کہا۔ "جان صاحب کے کچھ ملنے والے آئے تھے، وہ ان کے ساتھ گئے ہیں۔"

وہ جھنجلا گئی۔ قادر جان کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ پولیس والوں نے بوڑھے ملازم کا بیان لے کر اسے چھوڑ دیا تھا تاکہ حیات بیگم کو کسی طرح شبہ نہ ہو۔ برکت پولیس

والوں کی مدد سے چپ چاپ اپنے والد تک پہنچنا چاہتا تھا۔ قادر جان سے کہا جا رہا تھا کہ وہ انہیں حشمت علی تک پہنچا دے۔ اسے کم سے کم سزا دی جائے گی۔

پہلے وہ ڈھیٹ بنا رہا۔ بتانے سے انکار کرتا رہا پھر اسے ڈنڈے پڑنے لگے۔ مار کھاتے کھاتے بری حالت ہونے لگی اور جب تکلیف ناقابلِ برداشت ہونے لگی تو اس نے سب کچھ اگل دیا کہ اس کی بہن اور بہنوئی نے برکت سے کیسے کیسے فراڈ کیے ہیں اور حشمت علی کو کہاں قید کیا گیا ہے۔

☆======☆======☆

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سلمان اور کامران ایک کمرے میں تھے۔ انہوں نے دروازے کو اندر سے بند کر رکھا تھا۔ سلمان اسے بتا رہا تھا کہ آج لنچ کے وقت قادر جان نے اسے کس طرح زہریلی لسی کے ذریعے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ کامران کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ صدمے سے نڈھال ہو رہا تھا۔

سلمان نے کہا۔ "میرے یار! زیادہ غم نہ کر۔ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے۔"

"اللہ بچاتا ہے اور بچنے کی عقل بھی دیتا ہے۔ آج یہ ثابت ہو گیا کہ تُو اپنے گھر میں' اپنے والدین کے سائے میں محفوظ نہیں ہے اسی لیے ممی آج مجھے اپنے ساتھ باہر لنچ کے لیے لے گئی تھیں۔ وہ جانتی ہیں کہ پانی ہو' یا شربت ہو یا لسی ہم ایک ہی گلاس میں پیتے ہیں۔"

"تُو نے وعدہ کیا ہے' یہ بات ابھی کسی پر ظاہر نہیں کرے گا۔ ممی سے بھی جھگڑا نہیں کرے گا۔"

"میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا لیکن ایک بات سوچ رہا ہوں۔"

"کیا سوچ رہا ہے؟"

"یہی کہ تیرے ساتھ سگا بن کر دیکھ چکا ہوں۔ تجھے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔ آج میری محبت' میری دوستی تیری جان لینے والی تھی۔"

"یار! ایسا ایک بار ہوا ہے۔ بار بار نہیں ہو گا۔ تُو اس بات کو دل پر نہ لے۔"

"تجھے بار بار حقوق سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب میں سوچ رہا ہوں' سوتیلا بن کر تیرے لیے کچھ کروں۔"

سلمان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سوتیلا بن کر کیا کر سکے گا؟"

"ممی کا اعتماد حاصل کروں گا۔ وہ مجھے اپنا اور تجھے پرایا سمجھ کر بتایا کریں گی کہ آئندہ تیرے ساتھ کیا سلوک کرنے والی ہیں۔ جس طرح آج میں تاریکی میں رہا آئندہ نہیں رہوں گا۔"

وہ اٹھ کر جانے لگا۔ سلمان نے پوچھا۔ "کہاں جا رہا ہے؟"

"ممی کے پاس۔ ان کے ساتھ کچھ وقت گزاروں گا۔"

"میں آبرو کے ساتھ الحمرا جا رہا ہوں۔ تُو نہیں چلے گا؟"

"آج نہیں پھر کبھی ساتھ چلیں گے۔"

اس نے بڑی محبت سے سلمان کو دیکھا پھر وہاں سے چلتا ہوا آبرو کے پاس آیا۔ وہ بولی۔ "سلمان نے بتایا ہو گا کہ ہم اسٹیج پلے دیکھنے جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔ تم سے معذرت چاہنے آیا ہوں۔ میں نہیں جا سکوں گا۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "تم اور سلمان کے ساتھ نہ جاؤ؟ یہ ہو نہیں سکتا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ سلمان سے بھی کہہ چکا ہوں۔ آج میں تم دونوں کے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔ مجھے ممی سے کچھ ضروری کام ہے۔"

"تمہاری مرضی ہے۔ ویسے ہم تمہیں مِس کریں گے۔"

"آبرو! شملہ پہاڑی کے پاس تمہارا ایک پرسنل کاٹیج ہے۔"

"ہاں۔ تم اور سلمان کئی بار جا چکے ہو۔"

"مجھے اس کاٹیج کی چابیاں چاہئیں۔ میں وہاں تنہائی میں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "آج تم بہت زیادہ سنجیدہ ہو اور میں اس کی وجہ جانتی ہوں۔ آج سلمان کو کچھ ہو جاتا تو تم بھی زندہ نہ رہتے۔ پلیز کامران! اسے نظرانداز کرو۔ زندگی میں ایسے خطرات سے گزرنا پڑتا ہے۔"

"تم لیکچر دو گی یا چابیاں دو گی؟"

اس نے چابیوں کا ایک گچھا اسے دے دیا۔ وہ اسے جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "تھینک یو۔"

وہ بولی۔ "اے! مجھے اپنا سمجھتے ہو اور تھینک یو کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔"

"سوری۔ غلطی ہو گئی۔"

وہ سنجیدگی سے مسکراتا ہوا' اس کے کمرے سے باہر آیا۔ حیات بیگم اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ کامران نے آ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے ممی! آپ پریشان کیوں دکھائی دے رہی ہیں؟"

وہ جھنجلا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تمہارے ماموں جان نے پریشان کر رکھا ہے۔ پتا نہیں دوپہر سے کہاں مر گیا ہے۔ رات ہو چکی ہے۔ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔"

وہ ماں کے قدموں میں فرش پر بیٹھ گیا۔ "ارے یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ یہاں میرے پاس آؤ۔"

"ممی! مجھے یہیں بیٹھنے دیں۔ زندگی میں پہلی بار یہ حقیقت سمجھ میں آ رہی ہے کہ جنت صرف ماں کے قدموں میں ہوتی ہے۔"

"کیا بات ہے بیٹے! تم بہت سنجیدہ اور اداس ہو؟"

"آج میں نے زندگی کی سب سے بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"آپ مجھے سمجھایا کرتی تھیں کہ سوتیلا ہر حال میں سوتیلا ہوتا ہے۔ آج سلمان نے صاف طور پر نفرت سے مجھے سوتیلا کہا ہے۔"

"تعجب ہے۔ اس نے ایسا کیوں کہا؟"

"پتا نہیں۔ میں اس کے پاس گیا تو اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ کہنے لگا' آخر تم نے سوتیلا بن کر دکھا ہی دیا۔ لنچ کے بہانے ماں کے ساتھ گئے تھے۔ میں نے کہا' اس میں حرج کیا ہے؟ میں نے تمہارا کیا نقصان کیا ہے؟ وہ کہنے لگا' میں ابھی کچھ نہیں کہوں گا۔ پہلے قادر ماموں کو آنے دو۔ ان سے نمٹنے کے بعد تم سے بھی نمٹ لوں گا۔"

حیات بیگم کے دل میں چور تھا۔ وہ بیٹے کی بات کے پس منظر کو سمجھ گئی۔ انجان بن کر بولی۔ "وہ تمہارے ماموں سے کس معاملے میں نمٹنا چاہتا ہے۔ آخر بات کیا ہے؟"

"یہی بات وہ نہیں بتا رہا ہے۔ جب اس نے آپ کی شان میں گستاخی کی تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے کہا' آئندہ تم نے میری ممی کے خلاف کچھ کہا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ میں اسے غصہ دکھا کر چلا آیا۔"

"بیٹے! میں اسی دن کے لیے تمہیں سمجھایا کرتی تھی کہ سانپ سے دوستی کرو۔ سوتیلے سے نہ کرو۔"

"ممی! میں کیا کرتا۔ اس نے مجھے بچپن سے اندھا بنا دیا تھا۔ مجھے آپ نظر نہیں آتی تھیں۔ وہی نظر آتا رہتا تھا۔"

حیات بیگم نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر کہا۔ "میں بہت خوش ہوں کہ میرا بیٹا میرا ہو گیا ہے۔ اس کم بخت سوتیلے کے فریب سے نکل گیا ہے لیکن پریشانی یہ ہے کہ وہ تمہارے ماموں جان کا دشمن کیوں ہے؟ اور ان کے خلاف کیا کرنا چاہتا ہے؟"

"اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ماموں جان کی جان بھی لے سکتا ہے اور میرے خلاف بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

وہ حقارت سے بولی۔ "وہ ماں کی ممتا اور اس کے ارادوں کو سمجھ نہیں سکتا ہے۔ تم پر ذرا سی بھی آنچ آئے گی تو میں اسے زندہ جلا دوں گی۔"

"آبرو بھی اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ اچھا ہوا کہ میں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا۔ وہ دونوں شادی سے پہلے بے شرمی دکھا رہے ہیں۔ میں نے دروازے کی آڑ سے چھپ کر سنا تھا' وہ دونوں الحمرا جانے کے بہانے شملہ پہاڑی والے کاٹیج میں جا رہے ہیں۔ وہاں تنہائی میں وقت گزاریں گے۔ انہوں نے لاہور کو لندن سمجھ لیا ہے۔"

"ہوں۔ شملہ پہاڑی کا کاٹیج۔" وہ ہونٹوں کو بھینچ کر سوچنے لگی۔ "جو کام قادر جان سے نہ ہو سکا' وہ مجھے کرنا ہو گا اور میں ضرور کروں گی۔"

حیات بیگم اندر سے خوف زدہ تھی کہ جانے قادر جان نے کیسی غلطی کی ہے؟ اس نے کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑ دیا ہے جس سے اسے گرفتاری کا خوف ہے اور وہ کہیں چھپتا پھر رہا ہے۔ کوئی ثبوت ہو یا اس کی کوئی کمزوری ہو' وہ سلمان کے ہاتھ میں ہے اور اس نے انتقام لینے کے لیے کامران کی برسوں کی دوستی کو بھی بھلا دیا ہے اور پوری طرح سوتیلے پن پر اتر آیا ہے۔

کامران نے ماں کے قدموں سے اٹھ کر کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ آدھ گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔"

"میری کار نہ لے جانا۔ میں ابھی ضروری کام سے جاؤں گی۔"

وہ چلا گیا۔ حیات بیگم اپنے کمرے سے نکل کر آبرو کے کمرے کی طرف آئی۔ ایک

کھڑکی سے دیکھا۔ وہ ایک بہترین لباس پہنے ہوئے تھی اور لباس پر پرفیوم اسپرے کر رہی تھی۔ یقیناً باہر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

وہ کھڑکی سے ہٹ کر پھر اپنے کمرے میں آ گئی لیکن کھلے ہوئے دروازے کے قریب رہی تاکہ آنے جانے والوں کو دیکھتی رہے۔ تھوڑی دیر بعد آبرو اپنے کمرے سے نکل کر اس کاریڈور کی طرف جانے لگی' جدھر سلمان کا کمرا تھا۔ حیات بیگم نے اپنا پرس اٹھایا۔ اس میں کچھ ضروری چیزیں رکھیں پھر کوٹھی کے پچھلے دروازے سے نکل کر ایک طرف سے گھومتی ہوئی سامنے والے حصے کی طرف آئی۔ آبرو اور سلمان کوٹھی سے نکل کر کار میں بیٹھ رہے تھے پھر وہ کار آہستہ آہستہ چلتی ہوئی احاطے سے باہر چلی گئی۔

حیات بیگم کو ان کی منزل کا پتا تھا۔ وہ اطمینان سے چلتی ہوئی اپنی کار میں آ کر بیٹھ گئی پھر اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گئی۔

آگے ہمیشہ منزل ہوتی ہے یا منزل کا فریب ہوتا ہے۔

☆======☆======☆

رات ہو' تنہائی ہو اور کہیں سے مداخلت نہ ہو تو پھر آواز دیتے ہی آئیڈیل چلی آتی ہے۔

کامران نے اس کا دھیان کیا پھر سرگوشی میں پکارا۔ "آؤ!"

آبرو اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی پھر آس پاس دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہاں ویرانی اور خاموشی ہے۔ تم اکثر آدھی رات کے بعد بلایا کرتے ہو' جب گھر کے تمام افراد سو جاتے ہیں۔ اس وقت سلمان بھی گہری نیند میں ہوتا ہے۔ آج اتنی جلدی میری یاد کیسے آ گئی؟"

"وہ اپنی آبرو کے ساتھ تفریح کے لیے گیا ہے۔ اس طرح مجھے بھی تم سے تنہائی میں ملنے کا موقع مل گیا ہے۔"

"تم اس طرح کب تک مجھے بلاتے رہو گے؟ کب تک میرے ساتھ ایسی زندگی گزارتے رہو گے؟"

"کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہارے ساتھ جیوں گا اور تمہارے ساتھ مروں گا۔"

"تم میرے دیوانے ہو۔ مجھے پورا یقین ہے' ہم ساتھ جئیں گے اور ساتھ مریں گے لیکن آج تمہاری آواز اور لہجے سے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے دل ٹوٹا ہوا ہے۔"

"دنیا والوں کی خود غرضی سے دل ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک ماں جو مجھے چاہتی ہے' وہ پرائی اولاد کو کیوں نہیں چاہتی؟ ماں تو آخر ماں ہوتی ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سخت عذاب سے گزر کر ایک بچے کو جنم دیتی ہے پھر اسے اتنے عذاب سے گزرنے کے بعد بھی دوسری ماں کا درد محسوس کیوں نہیں ہوتا؟"

"میں تمہاری اس بات پر افسوس کر سکتی ہوں۔ کسی ماں کو سمجھا نہیں سکتی۔"

"کوئی کسی کو سمجھا نہیں سکتا پھر بھی سمجھانے کی روایات چلی آ رہی ہیں اور سمجھانے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں' اگر ایک ماں کا جوان بیٹا اچانک مر جائے اور اس کی گود خالی ہو جائے تو کیا اس کی سمجھ میں آئے گا کہ کسی کے جوان بیٹے کو زہریلی لسّی نہیں پلانا چاہیے۔"

"نہ سمجھنے والے کو دم توڑتے وقت بھی نصیحت سمجھ میں نہیں آتی۔"

اس نے سینٹر ٹیبل پر سے ایک آڈیو کیسٹ کو اٹھایا۔ آبرو نے پوچھا۔ "کیا گیت مالا ہے؟"

"محبت کی مالا ہے۔ ایک دن آبرو اور سلمان تنہائی میں بیٹھے پیار بھری باتیں کر رہے تھے۔ میں نے چوری چوری ان کی باتیں ریکارڈ کر لی تھیں۔ اسے سنو اور اندازہ کرو کہ وہ دونوں کس طرح ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔"

اس نے سوئچ کو آن کیا پھر کیسٹ ریکارڈر میں لگا کر اسے آن کیا اور اس کی آواز بڑھا دی۔ آبرو نے کہا۔ "آواز کیوں بڑھا دی۔ آبرو اور سلمان نے پیار میں سرگوشیاں کی ہیں۔ انہیں کسی اور کو نہیں سننا چاہیے۔"

"پیار سرگوشی میں ہو' یا ڈنکے کی چوٹ پر' اس کی آواز کو دور تک جانا چاہیے۔ پیار کا پیغام جہاں تک پہنچے' اسے پہنچنا چاہیے۔"

کیسٹ سے ابھرنے والی آبرو اور سلمان کی آواز بند کمرے کے باہر جا رہی تھی۔ دروازے سے کان لگا کر سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ بند کمرے کے اندر وہ دونوں موجود ہیں۔ وہ تیزی سے پلٹ کر باہر آئی۔ احاطے کے باہر کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کار کی ڈکی میں سے ایک بڑا کین نکالا۔ وہ کین پٹرول سے بھرا ہوا تھا۔ بہت بھاری تھا لیکن خود غرضی سے زیادہ بھاری اور بوجھل نہیں تھا۔

وہ بڑی محنت سے اٹھا کر اندر لائی۔ جس کمرے سے آبرو اور سلمان کی باتیں کرنے

کی آوازیں آرہی تھیں' اس کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا پھر اس کے چاروں طرف پٹرول چھڑکنے لگی۔

ٹھیک اسی وقت کراچی میں قادر جان کی نشاندہی پر پولیس والے چھاپا مار کر چوہدری حشمت علی کو رہائی دلا رہے تھے اور رحمت علی کو گرفتار کر رہے تھے۔

کامران ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر کمرے میں اپنی آبرو سے باتیں کر رہا تھا۔ آبرو نے کہا۔ "کھڑکیوں کی طرف دیکھو۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔"

"تم دیکھ رہی ہو اور میں سمجھ رہا ہوں' چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔"

"تمہیں اس آگ سے بچنا چاہیے۔"

"تم باہر کی آگ سے بچنے کی کہہ رہی ہو۔ اندر جو آگ لگی ہے' اس سے کیسے بچ پائیں گے؟"

ممتا کی آگ............ اے ماں! تُو خوش رہے۔

عشق کی آگ............ اے دیوانگی! تُو قائم رہے۔

دوستی کی آگ............ اے آبروئے دوستاں! تُو سلامت رہے۔

سچی آگ وہ ہے' جو لگائی نہیں جاتی' لگ جاتی ہے اور جلنے والوں کو زندہ جاوید رکھتی ہے اور وہ آگ جو لگائی جاتی ہے' دکھائی دیتی ہے' وہ اکثر اپنا ہی گھر جلا دیتی ہے۔

اور ایسی ماں تو کوئی نہ ہوگی' جو اپنی کوکھ جلا کر آرام سے کار چلاتی ہوئی گھر واپس جا رہی تھی۔

=====ختم شد=====